امیر عبدالقادر الجزائری

سچے جہاد کی ایک داستان



جان ڈبلیو کائزر

امیر عبدالقادر الجزائریؒ

سچے جہاد کی ایک داستان

تصنیف

جان ڈبلیو کائزر

نامعلوم مترجم کے ترجمے کی نظر ثانی، ترتیب و تدوین اور اشاعت کا اہتمام

عمار خان ناصر

اعتراف و افتخار: الشریعہ، مارچ ۲۰۱۲ء

دار الکتاب

نام نہاد مجاہد کی سوانح حیات سے اہم اقتباسات

اس سچے جہاد کو متعارف کروانے والے غامدی فرقے اور ان کے ہمنواؤں کی اپنی شناخت پر سوالیہ نشان؟

یہودی اور عیسائی بھی مسلمان ہیں۔	۴۹، ۵۰
مہر پر دو مثلثوں اور چھ کونے والے ستارے کا مخصوص یہودی مذہبی و روحانی نشان	۲۸۵
انتہائی خوشامدانہ انداز میں دشمن سے رحم کی التجا	۳۰۰
پردہ عربوں کا رواج ہے، مذہبی قانون نہیں	۳۰۲، ۳۰۳
اپنے ہاتھ سے اہم شخصیات کی شراب سے تواضع	۳۲۹
فرانس پر اعتماد کا مکمل اجر، بلکہ اس سے بھی زیادہ	۳۵۸
تلوار کی سیاست کا تباہی بربادی سے چولی دامن کا ساتھ ہے	۳۶۵
سچے راستے تعداد میں ایک سے زیادہ ہیں	۳۶۵
فرانس کے لیے کافر کا لفظ بھی استعمال کرنے سے باز آ گئے	۳۶۵
پادری کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر گرجا گھر میں عبادت کے چبوترے پر عیسائی انداز میں دعا	۳۶۷، ۳۶۸
فرانس کے بادشاہ کا ہاتھ چوم کر وفاداری کا عہد	۳۷۱
فرانس کی اطاعت قبول کرنے پر ایک لاکھ فرانک مشاہرہ	۳۷۵
وسیع النظر اسلام کی جدید تعبیر، اسلام سمیت کسی بھی مذہب کے تصور سے عظیم تر خدا پر یقین	۳۷۶
اسلام یہودیت و عیسائیت کو منسوخ کرنے نہیں، کامل بنانے آیا ہے	۳۸۶
مسجد کو چرچ بنانا درست ہے، ہمارے اور عیسائیوں کے درمیان فرق صرف طریقے کا ہے	۳۸۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کے دوران مسلم ممالک پر یورپ کے مختلف ممالک کی استعماری یلغار کے خلاف ان مسلم ممالک میں جن لوگوں نے مزاحمت کا پرچم بلند کیا اور ایک عرصہ تک جہاد آزادی کے عنوان سے داد شجاعت دیتے رہے، ان میں الجزائر کے امیر عبدالقادر الجزائریؒ کا نام صف اول کے مجاہدین آزادی میں شمار ہوتا ہے جن کی جرات واستقلال، عزیمت واستقامت اور حوصلہ وتدبر کو ان کے دشمنوں نے بھی سراہا اور ان کا نام تاریخ میں ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گیا۔

امیر عبدالقادر مئی ۱۸۰۷ء میں الجزائر میں، قیطنہ نامی بستی میں ایک عالم دین اور روحانی راہنما الشیخ محی الدینؒ کے ہاں پیدا ہوئے اور اپنے والد محترم سے اور ان کے زیر سایہ دیگر مختلف علماء کرام سے ضروری دینی وعصری تعلیم حاصل کی اور ان کے ساتھ ۱۸۲۵ء میں حج بیت اللہ کی سعادت سے بھی بہرہ ور ہوئے۔

یہ وہ دور تھا جب مغرب کے استعماری ممالک ''انقلاب فرانس'' کی کوکھ سے جنم لینے والی جدید مغربی تہذیب وثقافت کی برتری کے نشے سے سرشار تھے اور سائنسی ترقی سے حاصل ہونے والی عسکری قوت اور ٹیکنالوجی کی صلاحیت نے انھیں پوری دنیا پر حکمرانی کا شوق دلا دیا تھا۔ عالم اسلام کی دو بڑی قوتیں خلافت عثمانیہ اور مغل بادشاہت ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھیں، چنانچہ برطانیہ، فرانس، اٹلی، ہالینڈ، پرتگال اور دوسرے ممالک نے ان دونوں قوتوں سے نبرد آزما

ہونے کے لیے مختلف اطراف میں یلغار کی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ افریقہ اور ایشیا کے ایک بڑے حصے کو نو آبادیات میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ خلافت عثمانیہ اور مغل بادشاہت کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ وہ سائنسی ترقی اور دنیا میں ہونے والی تہذیبی و معاشرتی اور سیاسی تبدیلیوں کا بروقت ادراک نہ کر سکیں اور ان کی یہ غفلت استعماری یلغار کے سامنے عالم اسلام کے ایک بڑے علاقے کے سرنڈر ہونے کے اسباب میں ایک اہم سبب ثابت ہوئی۔

بہر حال جب بہت سے مسلم ممالک نے مختلف یورپی ممالک کی نو آبادیاتی غلامی کا طوق گردنوں میں پہنا تو ہر جگہ حریت پسندوں اور آزادی کے متوالوں نے حالات کے اس جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور بہت دیر تک بغاوت اور سرکشی کا محاذ گرم رکھا۔ الجزائر پر فرانس کے تسلط کا آغاز انیسویں صدی کی تیسری دہائی کے آخر میں ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب جنوبی ایشیا میں برطانوی تسلط ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے ہو چکا تھا اور امام ولی اللہ دہلویؒ کے مکتب فکر بلکہ خانوادے سے تعلق رکھنے والے مجاہدین کا ایک گروہ سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی قیادت میں پشاور کے علاقے میں جہادی سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ ان کا وقتی سامنا اگرچہ سکھوں سے تھا، لیکن اپنے عزائم اور اہداف کے حوالے سے وہ برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف جہاد کے لیے بیس کیمپ حاصل کرنے میں مصروف تھے۔ اس قافلہ حریت نے ۱۸۳۰ء میں پشاور کے صوبہ پر قبضہ اور کم و بیش سات ماہ حکومت کرنے کے بعد ۶ رمئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں جام شہادت نوش کیا تھا۔

الجزائر میں جب ۱۸۳۰ء میں فرانس نے تسلط قائم کرنے کی کوشش کی تو علماء کرام اور مجاہدین کی ایک جماعت نے امیر عبدالقادرؒ کے والد محترم الشیخ محی الدینؒ کی قیادت میں تحریک مزاحمت کا آغاز کیا، مگر دو سال کے بعد ۱۸۳۲ء میں یہ دیکھتے ہوئے کہ اس مزاحمت کا سلسلہ بہت دیر تک قائم رہ سکتا ہے، تحریک مزاحمت کی مستقل منصوبہ بندی کی گئی اور الشیخ محی الدین کے جواں سال اور جواں ہمت بیٹے امیر عبدالقادر کو باقاعدہ امیر منتخب کر کے مزاحمت کی جدوجہد کو مستقل بنیادوں پر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔

امیر عبدالقادرؒ جذبہ جہاد کے ساتھ ساتھ فراست و تدبر کی نعمت سے بھی مالا مال تھے، اس لیے

انھوں نے اپنی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے الجزائری عوام اور قبائل کو اعتماد میں لیا، وسیع تر مشاورت کا سلسلہ قائم کیا، آزادی کی فوج کو وقت کے ہتھیاروں اور جنگ کی نئی تکنیک سے مسلح کیا اور ایک باقاعدہ فوج منظم کر کے الجزائر پر حملہ آور فرانسیسی فوجوں کے خلاف میدان جنگ میں نبرد آزما رہے۔ انھوں نے ۱۸۳۲ء سے ۱۸۴۷ء تک مسلسل سولہ سال تک فرانسیسی فوجوں کے خلاف جنگ لڑی، بہت سے معرکوں میں فرانسیسی فوجوں کو شکست سے دوچار کیا اور ایک بڑے علاقے پر کنٹرول حاصل کر کے امارت شرعیہ کا نظام قائم کیا۔ وہ اس وقت تک لڑتے رہے جب تک الجزائری عوام اور اسباب و وسائل نے ان کا ساتھ دیا اور جب حالات کی نامساعدت نے انھیں بالکل تنہا کر دیا اور الجزائر کے قبائل ایک ایک کر کے الگ ہوتے گئے تو ۱۸۴۸ء میں انھوں نے اور کوئی چارۂ کار نہ دیکھتے ہوئے ہتھیار ڈال دیے۔

انھیں گرفتار کر کے ۱۸۵۳ء تک فرانس کے مختلف قلعوں میں محبوس رکھا گیا اور پھر آزاد کر کے دمشق کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔ انھوں نے ۲۳ر دسمبر ۱۸۴۷ء کو ایک مشروط معاہدے کے تحت خود کو فرانسیسیوں کے حوالے کیا تھا، مگر ان کی شرائط کو قبول کیے جانے کے بعد بھی حسب معمول بالائے طاق رکھ دیا گیا تو ایک موقع پر انھوں نے اس حسرت کا اظہار کیا کہ:

"اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ ہمارے ساتھ یہ کچھ ہونا ہے جو ہو رہا ہے تو ہم جنگ ترک نہ کرتے اور مرتے دم تک لڑتے ہی رہتے۔"

وہ پہلے استنبول گئے اور پھر خلافت عثمانیہ کی ہدایت پر دمشق آ گئے جہاں انھوں نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ مالکی فقہ کے بڑے علما میں سے تھے اور تصوف میں الشیخ الاکبر محی الدین بن عربیؒ کے پیروکار اور ان کے علوم کے شارح تھے۔ دمشق میں قیام کے دوران انھیں ایک اور معرکے سے سابقہ درپیش ہوا کہ خلافت عثمانیہ کی طرف سے شام میں مقیم مسیحیوں پر جزیہ کا قانون تبدیل کیے جانے کے بعد اس مسئلے پر مسلم مسیحی کشمکش کا آغاز ہوا اور بہت سے حلقوں کی طرف سے قانون کی اس تبدیلی کو ناکام بنانے کے لیے مسیحیوں کے خلاف مسلمان عوام کو بھڑکانے کا سلسلہ شروع کیا گیا جس پر امیر عبدالقادر الجزائریؒ نے مسیحیوں کے خلاف اس یلغار کی مخالفت

کی اوران کی حمایت وتحفظ کے لیے کمربستہ ہو گیے۔اس وقت غصے میں بھرے ہوئے عوام کے لیے امیر عبدالقادر کا یہ اقدام قابل اعتراض تھا،لیکن وہ اپنے اس موقف پر قائم رہے کہ بے گناہ مسیحیوں کی جانیں بچانا ان کا شرعی فریضہ ہے اور وہ ایسا کر کے اپنے اسلامی فرض کی تکمیل کر رہے ہیں۔بتایا جاتا ہے کہ امیر عبدالقادر الجزائری کے اس جرات مندانہ اقدام کی وجہ سے کم وبیش پندرہ ہزار مسیحیوں کی جانیں بچیں جس کی وجہ سے انھیں مغربی دنیا میں بھی تحسین کی نظر سے دیکھا جانے لگا اور انھیں ''امن کا ہیرو'' قرار دے کر مغرب کے چوٹی کے سیاسی راہ نماؤں اور دانش وروں نے خراج تحسین پیش کیا،جبکہ نیو یارک ٹائمز نے ان کے کردار کی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا کہ ''عبدالقادر کے لیے یہ یقیناً عظمت کا اور حقیقی شان وشوکت کا باب ہے۔اس بات کو تاریخ میں رقم کرنا کوئی معمولی بات نہیں کہ مسلمانوں کی آزادی کے لیے لڑنے والا سب سے ثابت قدم سپاہی اپنے سیاسی زوال اور اپنی قوم کے ناگفتہ بہ حالات میں عیسائیوں کی زندگیوں اور حرمت کا سب سے نڈر نگہبان بن کر سامنے آیا۔جن شکستوں نے الجزائر کو فرانس کے آگے جھکایا تھا،ان کا بدلہ بہت حیرت انگیز طریقے سے اور اعلیٰ ظرفی سے لے لیا گیا ہے۔''

امیر عبدالقادر الجزائری کا یہ کردار دیکھ کر مجھے متحدہ ہندوستان کی تحریک آزادی کے ایک بڑے لیڈر مولانا عبید اللہ سندھیؒ یاد آجاتے ہیں اور مجھے ان دونوں بزرگوں میں مماثلت کے بعض پہلو بہت نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔مثلاً مولانا عبید اللہ سندھیؒ اگرچہ میدان جنگ کے نہیں، بلکہ میدان فکر وسیاست کے جرنیل تھے،مگر ان کی سوچ یہ تھی کہ ہمیں سیاست وجنگ کے روایتی طریقوں پر قناعت کرنے کی بجائے ان جدید اسالیب،تکنیک اور ہتھیاروں کو سیاست اور جنگ کے دونوں میدانوں میں اختیار کرنا چاہیے اور وہ عمر بھر اسی کے داعی رہے۔

انھوں نے جب دیکھا کہ وہ حرب وجنگ کے ذریعے سے برطانوی تسلط کے خلاف جنگ جیتنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں تو انھوں نے اس معروضی حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی جدوجہد کے لیے عدم تشدد کا راستہ اختیار کر لیا اور بقیہ عمر پر امن جدوجہد میں بسر کر دی۔

امیر عبدالقادر کی طرح مولانا سندھی نے بھی عملی تگ وتاز کے میدان کو اپنے لیے ہموار نہ

یہ عیسائی سلطنت عثمانیہ کے باغی تھے۔یورپی طاقتوں کے شہ پر جزیہ دینے سے منکر تھے جو محض سالانہ دس شلنگ تھا۔دیکھیے ص ۱۲۹

پاتے ہوئے تعلیم وتدریس کا راستہ اختیار کیا اور ہندوستان واپسی کے بعد دہلی اور دوسرے مقامات میں قرآن کریم کے تعلیمی حلقے قائم کر کے اپنے فکر وفلسفہ کی تدریس وتعلیم میں مصروف ہو گئے۔

مولانا سندھیؒ مغربی تہذیب وثقافت اور تکنیک وصلاحیت کی ہر بات کو مسترد کر دینے کے قائل نہیں تھے، بلکہ اس کی ان باتوں کو اپنانے کے حامی تھے جو اسلامی اصولوں سے متصادم نہیں ہیں اور ہمارے لیے ضروری ہیں۔ اس کی وجہ سے انھیں بہت سے حلقوں کی طرف سے مطعون بھی ہونا پڑا۔

امیر عبدالقادر الجزائری کو شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کا پیروکار، ان کے علوم کا شارح اور ان کے فلسفہ وحدت الوجود کا قائل ہونے کی وجہ سے ان کے فکر کے ڈانڈے ''وحدت ادیان'' کے تصور سے ملانے کی کوشش کی گئی (جس کی جھلک جان کائزر کی زیر نظر کتاب میں بھی دکھائی دیتی ہے)، حالانکہ وحدت الوجود اور وحدت ادیان میں زمین وآسمان کا فرق ہے اور شیخ اکبرؒ کے نظریہ وحدت الوجود کا مطلب وحدت ادیان ہرگز نہیں ہے۔ اسی طرح مولانا عبید اللہ سندھی کو بھی فرنگی تسلط کے خلاف سیاسی طور پر ہندوستانی اقوام کے ''متحدہ قومیت'' کے نظریہ پر ہدف تنقید بنایا گیا اور انھیں ''وحدت ادیان'' سے جوڑنے کی کوشش کی گئی۔

امیر عبدالقادر الجزائریؒ مغربی استعمار کے تسلط کے خلاف مسلمانوں کے جذبہ حریت اور جوش ومزاحمت کی علامت تھے اور وہ اپنی جدوجہد میں جہاد کے شرعی واخلاقی اصولوں کی پاسداری اور اپنے اعلیٰ کردار کے حوالے سے امت مسلمہ کے محسنین میں سے ہیں۔ ان کے سوانح وافکار اور عملی جدوجہد کے بارے میں جان کائزر کی یہ تصنیف نئی پود کو ان کی شخصیت اور جدوجہد سے واقف کرانے میں یقیناً مفید ثابت ہوگی۔ ایسی شخصیات کے ساتھ نئی نسل کا تعارف اور ان کے کردار اور افکار وتعلیمات سے آگاہی استعماری تسلط اور یلغار کے آج کے تازہ عالمی منظر میں مسلم امہ کے لیے راہ نمائی کا ذریعہ ہے اور اس سمت میں کوئی بھی مثبت پیش رفت ہمارے لیے ملی ضرورت کی حیثیت رکھتی ہے۔

ابو عمار زاہد الراشدی

ڈائریکٹر الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ

۷ر جون ۲۰۱۱ء

سب باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ مختلف روحانی سلسلوں کے بارے میں بتاتے ہوئے محی الدین کا انداز جس طرح مودبانہ ہوجاتا تھا، اس سے عبدالقادر کو اپنے باپ کی اعتدال پسندی اور دوسروں کے لیے رواداری کو سمجھنے میں مدد ملی۔ محی الدین نے بتایا کہ فرقوں اور مسالک کا فرق اپنی جگہ لیکن انسان کو بھٹکنے سے صرف دو چیزیں بچاتی ہیں : ایک قرآن پاک اور دوسری نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے ملنے والی ہدایت۔

حاجیوں کے قافلے نے قسطنطینہ کو زیریں جانب سے عبور کیا۔ اس شہر کا نام اس رومن شہنشاہ کے نام پر رکھا گیا تھا جس نے عیسائیت کو اپنی سلطنت کا سرکاری مذہب قرار دیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے تیونس کا رخ کیا جہاں سے وہ سمندر کے راستے اسکندریہ روانہ ہوئے۔ راستے میں عبدالقادر نے رومی باپ اور بربر ماں کے بیٹے سینٹ آگسٹائن کی جائے پیدائش تھگاسٹ (Thagaste) کے خاموش کھنڈر بھی دیکھے۔

تیونس میں پہلی بار عبدالقادر کی ملاقات ایک فرانسیسی سے ہوئی۔ کیپٹن یووا بحری جہاز کا کپتان تھا اور ایک عجیب زبان بولتا تھا جو عربی، مالٹائی اور فرانسیسی کا ملغوبہ تھی۔ عبدالقادر کو پہلے کبھی یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ دنیا میں علم کا اظہار عربی اور یونانی کے علاوہ کسی اور زبان میں بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس نے اپنے والد سے پوچھا کہ کیا مختلف زبانوں کی وجہ سے علم محدود نہیں ہوجاتا؟ تو محی الدین نے اسے عیسائیوں کی مقدس کتاب کے بارے میں یاد دلایا کہ بائبل میں خدا نے لوگوں کو اس لیے سزا دی تھی کہ وہ اس چیز کو ایک کرنا چاہتے تھے، جسے خدا نے الگ الگ رکھا تھا۔ قرآن نے بھی یہی پیغام دیا ہے: ''اگر وہ ایک ہی امت تخلیق کرنا چاہتا تو ایسا کرسکتا تھا۔'' اس نے مختلف قومیں اور قبائل تخلیق کیے تاکہ وہ ایک دوسرے سے سیکھیں اور اچھے کاموں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں۔

محی الدین نے اپنے بیٹے سے کہا: ''اب تم ایسی جگہیں دیکھ سکو گے جہاں بہت سے عیسائی اور یہودی رہتے ہیں۔ یہ مت بھولنا کہ ان تک خدا کی ہدایت ہم سے پہلے پہنچی تھا۔ ابراہیم مسلمان تھے۔''

''لیکن وہ مسلمان کیسے ہوسکتے ہیں؟ اس وقت تو ابھی اسلام نازل بھی نہیں ہوا تھا؟''

یہودی اور عیسائی بھی مسلمان ہیں: وحدت ادیان کی واضح تبلیغ

''اس لیے کہ انہوں نے خود کو خدا کی اطاعت میں دے دیا تھا۔ مسلمان وہ ہوتا ہے جو خود کو خدا کی رضا کے سپرد کر دیتا ہے۔''

'' تو پھر کیا یہودی اور عیسائی بھی مسلمان ہیں؟''

''ہاں، یقیناً، بشرطیکہ وہ پورے خلوص کے ساتھ خدا کی منشا کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کریں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے عیسائیوں کو جو دعا سکھائی تھی، اس کا ایک حصہ یہ ہے کہ:

''ان کے ساتھ زمین پر بھی جنت والا معاملہ ہوگا۔''

اسکندریہ میں عبدالقادر کو اتنی متنوع ثقافتیں اور مذاہب دیکھنے کو ملے جن کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہاں عیسائیوں کے بہت سے فرقے تھے: آرتھوڈوکس یونانی، کیتھولک، آرمینائی، قبطی اور حیرت انگیز طور پر عیسائی عرب بھی موجود تھے۔ وہ سب ایک دوسرے سے مختلف تھے، لیکن عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ وابستگی میں سب ایک جیسے تھے۔ یہودی بھی ویسے نہیں تھے جیسے خطہ مغرب میں نظر آتے تھے۔ عبدالقادر کی ملاقات مختلف فقہی مذاہب سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں سے ہوئی جو خدا کے کلام کی تشریح مختلف طریقوں سے کرتے ہیں۔ کئی روز تک اس مغربی نوجوان نے طرح طرح کے سوالات سے ان عالموں کی ناک میں دم کیے رکھا جنہوں نے اس کے والد کو ملاقات کے لیے مدعو کیا تھا۔ وہ سب اس نوعمر لڑکے کی دانش پر دنگ تھے۔

اب حجاج دریائے نیل کے راستے قاہرہ کی سمت میں روانہ ہوگئے۔ ایک بار پھر محی الدین نے اپنے بیٹے کو خدا کے بندوں کی بوقلمونی سے روشناس کرایا۔ یہ تنوع مسلمانوں میں بھی تھا۔ عبدالقادر کئی مذہبی فرقوں کے لوگوں سے ملا جو اندلس سے ہجرت کر کے مصر میں آباد ہوئے تھے۔ اندلس کبھی یہودی، عیسائی اور مسلم ثقافتوں کا گہوارہ ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے مشہور زمانہ جامعہ الازہر کا دورہ بھی کیا جسے مسلمانوں کا ''ہارورڈ لا اسکول'' کہا جا سکتا ہے۔ علم وفضل کے اس گراں قدر مرکز کا اثر ونفوذ ساری مسلم دنیا میں پھیلا ہوا تھا، لیکن ہارورڈ* کے برخلاف، جس کا آغاز خدا کے نائبین کی تربیت کی درسگاہ کے طور پر ہی ہوا تھا، الازہر نے کبھی خدا کو قانون یا دنیاوی علم سے الگ نہیں کیا۔

---

*ہارورڈ کالج کی بنیاد ۱۸۳۶ء میں ایک مذہبی درسگاہ کے طور پر رکھی گئی تھی۔ اس کا پہلا سرپرست جان ہارورڈ ایک وزیر تھا۔

بارے میں اس کی کیا رائے تھی، مغرب کے لوگوں کا حکومت عثمانیہ کے بارے میں رویہ کیسا تھا اور یورپی قوتوں کے ارادوں کے بارے میں اس کا کیا خیال ہے؟

برسوں بعد عبدالقادر کو محمد علی کی بات یاد آئی جو اس نے محی الدین کو خبردار کرتے ہوئے کہی تھی کہ برطانوی اور فرانسیسی دنیا کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے یہ کام مصر سے شروع کیا تھا اور اب وہ شمالی افریقہ سے پرے طنجہ پر نظریں لگائے ہوئے ہیں۔ ''اور آپ، جناب محی الدین، ان کے عین وسط میں ہیں۔''

محمد علی سے ملاقات نے عبدالقادر پر گہرا نقش چھوڑا۔ ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر اس نوجوان عالم نے اس کی سوچ کو پرکھنے کے لیے اپنے دماغ میں موجود احادیث کے ذخیرے کو ٹٹولا: ''تمہارے دور کی عکاسی تمہارا حکمران کرتا ہے۔ اگر تم اچھا زمانہ چاہتے ہو تو اس بات کو یقینی بناؤ کہ تم نے اچھا حکمران منتخب کیا ہے۔''

اس کے علاوہ قرآن میں بھی ایک آیت موجود تھی جس میں ملکہ سبا سلیمان بادشاہ سے کہتی ہے کہ ''جب بادشاہ کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اسے تاخت وتاراج کر دیتے ہیں۔'' کیا عبدالقادر یہ سوچ رہا تھا کہ عظیم تاریخ دان اور فلسفی ابن خلدون نے بدووں کے بارے میں جو کچھ کہا، وہ درست تھا؟ کیا آزاد آدمی صرف آزاد منش خانہ بدوش ہی ہوتا ہے؟ اس کا رازدار خود صحرا ہوتا ہے۔ صاف، پاکیزہ، کرخت، معاف نہ کرنے والا، جہاں خدا کی آواز شہر کے ذہنی انتشار سے پاک ماحول میں واضح طور پر سنی جاسکتی ہے۔ کیا سارے نبی صحرا ہی سے نہیں آئے تھے؟

قاہرہ سے آگے کوہ سینا کی طرف جانے کے لیے انھوں نے اس راستے کا انتخاب کیا جس پر موسیٰ علیہ السلام چلے تھے۔ یہاں سینٹ کیتھرائن کی خانقاہ میں مہمان کے طور پر ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ انھوں نے راہبوں کے ساتھ خدا کی وحدانیت اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر گھنٹوں گفتگو کی۔ راہبوں کا کہنا تھا کہ خدا ایک ہے، لیکن ایک میں تین ہیں۔ مثلث، لیکن پھر بھی ایک۔ انہوں نے وضاحت کی کہ خدا نے انسان کا روپ دھارا اور انسان کے طور پر صعوبتیں برداشت کیں تا کہ اپنی مخلوق کو اپنی محبت کا دیدار کرا سکے۔ عبدالقادر سمجھ گیا کہ مسیح کا

عیسائیوں کے نزدیک وہی مرتبہ ہے جو مسلمانوں کے لیے قرآن کا، یعنی خدا کے کلام کا براہ راست ظہور۔ مسیح خدا کا کلمہ تھا جو گوشت پوست کی صورت میں ڈھل گیا۔ یسوع مسیح ہی راستہ تھا، پیغمبر اسلام کی طرح ایک نمونہ۔

لیکن خدا اپنے بیٹے کے قتل کی اجازت کیونکر دے سکتا تھا؟ کیا عیسائی مسیح کو، جو ایک انسان تھا، خدا کا شریک بنا کر اس کی عبادت نہیں کرتے؟ کیا وہ درحقیقت ایک سے زیادہ خداؤں کے ماننے والے نہیں ہیں؟ لیکن اگر خدا ہر شے کو محیط ہے، سب کچھ جاننے والا اور سب سے زیادہ طاقتور ہے تو پھر خدا انسان کیوں نہیں بن سکتا، اگر اس کی یہی منشا ہے؟ ان سوالوں کے عبدالقادر کے پاس تسلی بخش جواب نہیں تھے۔ اسلام میں خدا کے ننانوے نام ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا بھی ننانوے ہیں۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ خدا واحد ہے۔ خدا، خدا ہے، لیکن کیا سورج کی طرح خدا کی روشنی بھی مختلف رنگوں میں منعکس نہیں ہو سکتی؟

قرآن یہ بتاتا ہے کہ ابراہیم اور ان کے بیٹے اسمٰعیل نے مکہ کی مقدس سرزمین کے عین وسط میں ایک مکعب نما عمارت یعنی خانہ کعبہ تعمیر کیا جہاں دنیا بھر کے ان گنت لوگ یک جان بن جاتے ہیں۔ حاجیوں میں پائے جانے والے تنوع نے عبدالقادر کو حیران کر دیا۔ ان میں دنیا بھر سے آئے ہوئے کالے، گورے، زردرو، بھورے مسلمان مرد اور عورتیں شامل تھیں۔ عرب، مور، سیاہ فام افریقی، ترک، فارسی، ہندوستانی، جاوی حتیٰ کہ وسطی ایشیا کے تاتاری اور بخاری بھی تھے، لیکن کعبہ کا طواف کرتے ہوئے وہ سب ایک ہو جاتے تھے۔ سب نے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایک جیسا ان سلے کپڑے کا احرام باندھا ہوا تھا جو ان کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے باندھا تھا۔

چھ روز تیاری کے بعد حرم میں داخل ہو کر باپ بیٹا دونوں انسانوں کے اس منظم ہجوم میں شامل ہو گئے جو کعبہ کے گرد سات چکر لگا رہا تھا۔ ایسے متحرک چکر جس کا محیط کہیں نہ ہونے کے باوجود ہر جگہ ہے۔ عبدالقادر کو آرزیو میں اپنے استاد سیدی ابن طاہر کی بات یاد تھی: ”خدا نے جیومیٹری کے اصولوں کے ساتھ بدنظمی میں سے ترتیب پیدا کی۔ اشکال، افلاطون، اقلیدس۔ ذہین یونانیوں نے جیومیٹری کے ساتھ زمین کا محیط ناپ لیا اور ریاضی کی ان سچائیوں کو ثابت کیا جو ناقص اور توڑ مروڑ

امیر صاحب کی مہر میں خالص یہودی علامات

سے نہیں دیکھا۔ امیر کو قریب ہی عین سفارا لے جایا گیا جہاں اس نے اپنے ڈیرے کے بچے کھچے لوگوں کے سامنے تفصیل سے بتایا کہ اس کے اور شہزادے کے درمیان کیا معاہدہ ہوا ہے، یعنی وہ اگلے روز سمندر کے راستے مشرق وسطیٰ جائیں گے اور جو کوئی بھی اس کے ہمراہ جانا چاہے، جا سکتا ہے۔ ان کی تمام ذاتی اشیا، خیمے، گھوڑے، خچر، اونٹ فرانسیسی خرید لیں گے۔

اگلی صبح ڈیوک آف اومال نے اس چھوٹے سے میدان میں فوج کی پریڈ کا معائنہ کیا جسے عربوں نے جامع الغزوات کا نام دیا تھا۔ فوج کا معائنہ کرنے کے بعد نوجوان شہزادہ گھوڑا دوڑاتا ہوا عبدالقادر کے پاس آیا جو فرانسیسی دستوں کے قابل تعریف نظم وضبط کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے اپنے سپاہیوں میں اسی ڈسپلن کا اکثر فقدان رہتا تھا۔ جب ڈیوک قریب پہنچا تو عبدالقادر چھلانگ مار کر سیاہ گھوڑی سے اترا اور شہزادے سے مخاطب ہو کر کہا: ''میں یہ گھوڑی آپ کو تحفے میں دیتا ہوں۔ یہ میدان جنگ میں میری آخری سواری تھی۔ یہ میری سب سے پسندیدہ گھوڑی ہے، لیکن اب اس سے جدا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہ آپ کو ہمیشہ صحت اور سلامتی کے ساتھ خوشیوں کی طرف لے جائے۔''

''میں اسے فرانس کے لیے ممنونیت کے اظہار کے طور پر قبول کرتا ہوں جس کا تحفظ آج کے بعد آپ کو حاصل رہے گا اور اسے اس بات کی علامت سمجھتا ہوں کہ ماضی کو بھلا دیا جائے گا۔''

وہران جانے سے پہلے انہیں ایک بڑے بحری جہاز میں منتقل کر دیا گیا جہاں عبدالقادر سب کی توجہ کا مرکز تھا۔ ہر کوئی اس سے کوئی نہ کوئی نشانی لینے کا خواہشمند تھا۔ کوئی بیلٹ، خنجر، کپڑے کا ٹکڑا، نہیں تو آٹوگراف ہی سہی۔ کرنل مونتوبان نے بھی ہتھیار ڈالتے وقت کرنل کے اچھے برتاؤ کی تصدیق میں امیر سے چند سطریں لکھنے اور ان پر مہر ثبت کرنے کی فرمائش کی۔ * عبدالقادر نے یہ تحریر کرنل کے بیٹے کو مخاطب کر کے لکھی جس میں اس کے والد کے مہربان رویے کی تعریف کی گئی تھی۔

* امیر کی مہر دو مثلثوں پر مشتمل تھی جن میں ایک سیدھی اور دوسری معکوس تھی۔ دونوں مثلثیں ایک دوسرے کے اوپر تھیں جس سے چھ کونوں والے ستارے کی شکل بن جاتی تھی۔ ان کے اردگرد ایک دائرہ تھا۔ اوپر کی طرف نوک والی مثلث روحانی طاقت کی علامت تھی جب کہ نیچے کی طرف نوک والی مثلث دنیاوی اقتدار کی نمائندگی کرتی تھی۔ دائرہ الوہی رحمت کی علامت تھا۔

یہ خالص صیہونی و یہودی تشریح ہے۔

دھوکہ دیتے آرہے تھے۔ سر چھپانے کے لیے ایک خیمہ، سادہ غذا اور لباس، میرا گھوڑا اور ہتھیار! اس دنیا میں مجھے صرف انہی چیزوں کی ضرورت ہے۔ میں پھر یہ کہتا ہوں کہ مجھے مکہ جانے، مقدس کتابیں پڑھنے، خدا کی عبادت کرنے اور مدینہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روضے کا دیدار کرنے کے بعد مکہ میں دفن ہونے کے سوا کوئی آرزو نہیں ہے۔ دنیا کی اسٹیج پر میرا کردار اب ختم ہو چکا ہے۔ میں نے تمہیں زبان دی ہے۔ اگر مجھے پتہ چلے کہ الجزیرہ میں تمہارے سارے آدمی مارے گئے ہیں اور شہر میں صرف عورتیں رہ گئی ہیں، تب بھی میں فرانس کے خلاف جنگ نہیں کروں گا۔ یقین کرو میرے دوست، میں زندہ نظر آتا ہوں گا، لیکن در حقیقت میں مر چکا ہوں۔"

دوما نے جانے کے لیے رخصت چاہی۔ اسے یقین تھا کہ اس نے امیر کے اندر جھانک کر دیکھ لیا ہے اور وہ اسے بہت سیدھا سادہ اور بے چین لگا تھا۔ اس نے دو لفظوں میں بات ختم کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر اس سے مکہ جانے کی امید چھینی گئی تو وہ اندر سے ٹوٹ جائے گا اور ہو سکتا ہے دھوکہ دینے پر رضامند ہو جائے۔ قلعے سے جانے سے پہلے دوما نے روسو سے کہا کہ وہ عبدالقادر کو اس کی آمد کے اصل مقصد سے آگاہ کر دے، یعنی یہ کہ حکومت فرانس نے لاموری سیئر کے وعدے کی توثیق کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

اگلی صبح امیر کے استفسار پر دوما نے جھجکتے ہوئے کہا: "ہاں، یہ سچ ہے۔"

"مجھے یقین نہیں آتا!"، امیر ششدر تھا۔ "فرانس کی حکومت جنرل لاموری سیئر اور شاہ فرانس کے بیٹے کے وعدے کی پاسداری نہیں کرے گی؟ مارشل بوجو نے خود مجھے اسی قسم کی پیش کش کی تھی۔ اب تم بتاتے ہو کہ اب وہ خود کو وعدے کا پابند نہیں سمجھتے؟"

"وہ رائے عامہ سے ڈرتے ہیں"، دوما نے عذر پیش کیا۔ "وہاں ایسے لوگ ہیں جنھیں آپ پر اعتبار نہیں ہے اور ان کا خیال ہے کہ مشرق وسطیٰ میں پہنچ کر آپ زیادہ خطرناک ہو جائیں گے۔ قیدیوں کے قتل عام کا الزام ابھی تک آپ کے سر ہے۔"

عبدالقادر غصے کے عالم میں اپنی کرسی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا اور بولا: "اچھی بات ہے، ذرا ایک بار پھر مجھے اسی حیثیت میں واپس لے آئیں جس میں وعدہ کرنے سے پہلے تھا، پھر میں

دشمن سے مصالحت نہیں، رحم کی بھیک جس کی بنا پر موصوف مغرب کی آنکھوں کا تارا بن گئے۔

دیکھوں گا کہ مجھے پکڑنا آسان ہے یا مشکل۔''

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھائی رہی۔ پھر وہ دوبارہ گویا ہوا: ''کیا ہمیں مستقل طور پر فرانس میں رہنا ہوگا؟ ہم تمہاری زبان نہیں جانتے۔ ہمارے رسوم ورواج، ہمارے قوانین اور ہمارا مذہب سب کچھ تم سے مختلف ہے۔ ہمارا لباس، ہم سے متعلق ہر شے کو تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ کیا تمہیں سمجھتے نہیں کہ یہ سزائے موت کے مترادف ہے؟''

عبدالقادر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا اور شکست خوردہ انداز میں کہنے لگا: ''خواہ مخواہ اتنی لمبی بات کرنے کا کیا فائدہ؟ میں تمہارے قبضے میں ہوں۔ چاقو تمہارے ہاتھ میں ہے اور میں گوشت کے مانند ہوں۔ جیسے جی چاہے کاٹو۔''

دوما کے پاس بھی کہنے کو جیسے کچھ نہیں بچا تھا۔ کافی دیر دونوں خاموش رہے۔ پھر دوما نے کہا کہ خدا اس کی مدد کرے گا۔ اس نے عبدالقادر کو مشورہ دیا کہ وہ براہ راست شاہ فرانس کو خط لکھ کر اپنی تقدیر اس کے ہاتھ میں سونپ دے۔ ''وہ بہت مہربان اور دریا دل ہے۔ مناسب وقت آنے پر وہ آپ کی درخواست کو ضرور قبول کرے گا۔''

عبدالقادر متذبذب تھا کہ دوما نے جو کہا ہے، ویسا کرے یا نہ کرے۔ آخر وہ بادشاہ کی خداترسی کے لیے التجا کیوں کرے؟ یہ تو سیدھی سادی منصفانہ بات تھی کہ جو اس سے وعدہ کیا گیا ہے، اسے پورا کیا جائے۔ ایفائے عہد تو ایک مقدس ذمہ داری ہوتی ہے۔ لیکن دوما کی ہمدردی کو خلوص سمجھتے ہوئے امیر نے قلم اٹھایا اور کئی بار لکھنے اور کئی بار کاٹنے کے بعد بالآخر ایک خط لکھا جس کا دوما اور روسو نے امیر کے خلوص اور مسجع ومقفع انداز کو برقرار رکھتے ہوئے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔

عبدالقادر نے خط میں رحم اور انصاف کی التجاؤں کے بعد بادشاہ سے بالمشافہ ملاقات کی درخواست کی تھی۔ خط کے آخر میں امیر نے وہی جملہ لکھا جس کی دوما کو توقع تھی: ''خدائے برتر کی یہی منشا تھی کہ میں خود کو ایک بچے کی طرح آپ کے ہاتھوں میں سونپ دوں۔''

کئی گھنٹے بعد جب مصطفیٰ بن تہامی کو اس خط کے بارے میں پتہ چلا تو اس نے اس طرح خود کو گرا کر التجا کرنے پر اعتراض کیا اور پوچھا کہ آخر ایسا کرنے میں کیا دانشمندی تھی۔ اس کے خیال

جائے گا۔

عبدالقادر بات کرتے ہوئے جس غم وغصے کا اظہار کرتا تھا، اس کا ذکر کیے بغیر دوما نے وزارت کو لکھا کہ ''عبدالقادر کو اپنی ضروریات کی بھی کوئی پروا نہیں۔ وہ پرسکون ہے اور حالات کو اپنے قابو میں رکھے ہوئے ہے۔ اسے نہ صرف اس بات پر افسوس ہے کہ اس نے بادشاہ کو خط لکھا بلکہ مجھے یقین ہے کہ وہ کبھی بھی اپنی مرضی سے پر فرانس کو اس کے کیے ہوئے وعدے سے بری الذمہ نہیں کرے گا۔ وہ ہماری طاقت اور دولت سے مرعوب نہیں ہے اور فرانس میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں جس کا اسے لالچ ہو۔ اسے دنیاوی چیزوں میں سرے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔''

امیر کے اندر پھیلی کڑواہٹ اب اس کی گفتگو میں جھلکنے لگی تھی۔ دوما بھی اب عبدالقادر کا جعلی دوست کی بجائے مداح بنتا جا رہا تھا۔ ایک دن باتیں کرتے ہوئے امیر نے کہا: ''ایک قابل احترام دشمن کو مارنے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے۔ وہ آپ کا غلام بن جائے گا۔''

اس سے دوما کو نپولین کا مقولہ یاد آ گیا کہ: ''کسی کو اپنے دشمن کے ساتھ انصاف کرنے سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ ایسا کرنا ہمیشہ باوقار طریقہ ہوتا ہے اور بعض اوقات دانشمندانہ بھی۔''

دوما بتدریج عبدالقادر کی شخصیت کا اسیر ہوتا جا رہا تھا۔ دوسری طرف امیر بھی شائستہ اطوار والے اس فرانسیسی پر بہت زیادہ انحصار کرنے لگا تھا جس کے سامنے وہ اپنے حقیقی جذبات کا اظہار کر سکتا تھا۔ دوما نے وزیر جنگ کو خط میں لکھا تھا کہ ''وہ جنگجو ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ولی بھی ہے۔ جنگ نے اسے ناکام کر دیا ہے اور اب اس نے سکون کے لیے مذہب میں پناہ لی ہے۔''

لیکن دوما غلطی پر تھا۔ امیر کے لیے مذہب سکون تلاش کرنے کی جگہ نہیں تھا اور نہ جنگ اس کے لیے کوئی کھیل تماشہ یا پیشہ تھی جس میں اسے اطمنان ملتا تھا۔ مذہب تو اس کے روئیں روئیں میں رچا بسا تھا اور جنگ اور امن دونوں میں اس کی طاقت کا سرچشمہ تھا۔

بڑھتی ہوئی دوستی کے اظہار کے طور پر دوما نے ایک روز امیر کو دعوت دی کہ وہ اس کے اور اس کی بیوی کے ساتھ رات کا کھانا کھائے۔ دوما کی بیوی مارشل بوجو کی بھتیجی تھی۔ عبدالقادر کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے ہوئے دوما نے دریافت کیا کہ اگر اس کی بیوی یورپی طرز کے لباس میں،

پردہ رواج ہے، مذہب نہیں۔

چہرے کو نقاب میں چھپائے بغیر ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہوتو امیر کو برا تو نہیں لگے گا۔اس پر امیر نے وضاحت کی کہ چہرہ ڈھانپنا عربوں کا رواج ہے، ان کا مذہبی قانون نہیں۔

امیر کو مادام دوما کی ذہانت اور حلیمی و وقار بہت اچھا لگا۔اس نے مارشل بوجو کی شباہت تلاش کرنے کے لیے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔اس نے یہ بھی دیکھا کہ مادام کا لباس اس کی گردن کے گرد اچھی طرح لپٹا ہوا ہے اور اس کی آستینوں نے بازوؤں کو کلائی تک ڈھانپ رکھا ہے۔اس کا ڈھیلا ڈھالا اسکرٹ نیچے قالین تک پہنچ رہا تھا جس میں اس کے پاؤں بھی چھپ گئے تھے۔بعدازاں امیر نے دوما سے کہا کہ کمر سے تنگ ہونے کے باوجود مادام کا لباس کسی بھی طرح ایک عرب عورت سے کم مناسب نہیں تھا۔

طولون میں امیر عیسائی اور مسلمان عورتوں کے لباس کے یکساں طور پر موزوں ہونے پر غور کر رہا تھا اور ادھر پیرس میں اہم شخصیات عزت اور اعتماد کی مشترکہ اقدار کی بنیاد پر اس کا مقدمہ لڑ رہی تھیں۔چیمبر آف پیئرز (Chamber of Peers) کے سامنے ماسکو کا شہزادہ (جو مشہور مارشل نے (Marshal Ney) کا بیٹا تھا جو نپولین کی ماسکو سے عبرتناک شکست کا شاہد تھا) یہ اعلان کر رہا تھا: ''حکومت معاہدے کی توثیق کرنے میں ہچکچاہٹ ظاہر نہیں کر سکتی۔امیر کی مشرق وسطیٰ میں موجودگی سے لاحق ہونے والا خطرہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔جس بات کی سب سے زیادہ اہمیت ہے، وہ ہے فرانس کی دی ہوئی زبان۔آپ عبدالقادر کو کیا سمجھتے ہیں؟ کوئی لٹیرا؟ قزاق؟ یا شکست خوردہ فوج کا جرنیل؟ سب سے پہلے اسے قیدی بنائیں۔پھر اس کے ساتھ انسانی حقوق کے اس قانون کے مطابق سلوک کریں جو ہمارے اپنے انقلاب نے نافذ کیا ہے۔''

پھر جنرل فاوی یے (General Fabvier) اپنی نشست سے کھڑا ہوا اور اس بات پر زور دیا کہ فرانس کے جرنیلوں کے کیے ہوئے وعدے کا احترام ضرور کیا جانا چاہیے۔''فرانس کے مفادات اور اس کا وقار دونوں کا تقاضا ہے کہ معاہدے کی فی الفور توثیق کر دی جائے۔اس کی وجہ بہت واضح ہے۔فرانس کے مفادات اور اس کی اچھی ساکھ آپس میں لازم وملزوم ہیں اور انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔''

جدوجہد کرنے پر کسی طرح کی معذرت نہیں کی۔ تاہم اس نے واضح کیا کہ ''جب یہ اندازہ ہو گیا کہ خدا نے کسی حکمت کے تحت ہماری تائید سے ہاتھ کھینچ لیا ہے تو میں نے بھی اس دنیا سے ناطہ توڑنے کا فیصلہ کر لیا۔''

دوما سے کہے ہوئے الفاظ دہراتے ہوئے امیر نے لکھا تھا: ''اب آپ میرا شمار مردوں میں کریں۔ میری واحد خواہش یہ ہے کہ میں مکہ چلا جاؤں اور اس وقت تک خدا کی عبادت کرتا رہوں جب تک وہ مجھے اپنے پاس بلا نہیں لیتا۔''

پھر عبدالقادر نے خط میں اپنی طرف سے حلف بھی شامل کیا جو اس نے اپنے ہاتھ سے عربی میں لکھا تھا اور اس سے اسلامی قانون پر مکمل دسترس رکھنے والے شخص کی جامع مہارت جھلکتی تھی۔

''عظمت صرف خدا کی ہے!

میں حلف دیتا ہوں کہ کبھی فرانس کے لوگوں کے لیے پریشانی کھڑی نہیں کروں گا، نہ ذاتی طور پر، نہ خط لکھ کر اور نہ کسی اور طریقے سے۔ میں یہ حلف خدا، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، ابراہیم، موسیٰ اور یسوع مسیح کی قسم کھا کر، تورات، انجیل اور قرآن کے نام پر دیتا ہوں۔ میں یہ حلف اپنے دل، اپنے ہاتھ اور اپنی زبان سے دیتا ہوں۔ اس عہد کی پابندی مجھ پر اور میرے تمام ساتھیوں پر، جن کی تعداد ایک سو سے زائد ہے، جنھوں نے اس دستاویز پر دستخط کیے ہیں اور انہوں نے بھی جنھوں نے دستخط نہیں کیے، کیوں کہ انہیں لکھنا پڑھنا نہیں آتا، لازم ہے۔

والسلام

عبدالقادر بن محی الدین''

جب اولیوی اے واپس پیرس گیا تو امیر کو رہا کرنے کا سب سے بڑا حامی بن چکا تھا۔ اس نے نئے وزیر جنگ اور پانچ حکومتی سربراہوں میں سے ایک، ڈیوک آف آرا گو کو لکھا: ''عبدالقادر کو قبضے میں رکھنا اسے مار ڈالنے کے مترادف ہے۔ ہم نے اس کے اعتماد کو جو ٹھیس پہنچائی ہے، وہ اس کی جان لے رہی ہے۔ ہمارا وقار، جو ہمارا سب سے قیمتی اثاثہ ہے، اس وقت داؤ پر لگا ہوا ہے۔ میں ذاتی طور پر عبدالقادر کے خلوص نیت کا قائل ہوں۔ اس کا دیا ہوا حلف الجزائر کے طول وعرض

کرسکتا ہوں۔''

جلد ہی امیر کے لیے ایک عظیم ہمدردی پیدا ہوگئی۔ یہ ایک طرح کی سازش تھی جو خدا ترسی اور نیک نیتی کے ساتھ کی گئی تھی۔ ایسا کرنے والوں میں دوسو طاقتور فوجیوں کا کمانڈر کیپٹن سارا گوسا، کیپٹن بواسونے اور دوروں زدیک کے وہ لوگ شامل تھے جو امیر کی شخصیت سے متاثر ہوگئے تھے۔ پو میں اب گھر گھر دو موضوعات زیر بحث تھے : پیرس میں مسلسل تبدیل ہوتی ہوئی سیاسی دھڑے بندی اور ان کا نامور قیدی جس کی باتوں اور کاموں پر سماجی حلقوں میں گفتگو ختم ہونے میں ہی نہیں آتی تھی۔

عبدالقادر کے بارے میں طرح طرح کی باتیں گردش میں رہتی تھیں :

امیر آج کل بائبل کے عربی ترجمہ کا مطالعہ کررہا ہے جو اسے کونت آلبیر دے آر (Comte Albert de R) نے دیا تھا اور قرآن کا انجیل سے موازنہ کررہا ہے۔..... امیر کی والدہ گنٹھیا کی وجہ سے شدید تکلیف میں ہیں لیکن عربوں کو فرانسیسیوں کی دواؤں پر اعتماد نہیں اور اس کی بجائے وہ اپنے تعویذوں کو ترجیح دیتے ہیں۔..... وہ اپنی سوانح عمری اور عربوں کی تاریخ لکھ رہا ہے۔..... عبدالقادر الجبرا پڑھ رہا ہے۔..... ایک روز جب امیر کے ساتھ اہم مقامی شخصیات رات کے کھانے پر مدعو تھیں تو امیر نے شیمپین سے ان کی تواضع کی اور خود اپنے ہاتھ سے ان کے پیانوں میں شراب انڈیلی۔..... امیر کے جو ساتھی جزیرۂ مارگریٹ پر الگ کیے گئے تھے، وہ دوبارہ اس سے آن ملے۔ وہ سیڑھیوں پر سوتے ہیں اور سارے قلعے کو گندا کررہے ہیں۔..... اس رات چوک پر امیر تھا یا سرخ لبادے میں ملبوس اس کا بھائی کھڑا تھا؟..... اور کچھ غیر متوقع تبصرے، چٹکلے اور ملاقات کے لیے آنے والوں سے کہے گئے شائستہ جملے۔

مہمانوں کی شراب سے تواضع

جب افریقی جنگوں میں شرکت کرنے والا ایک کرنل اپنے جونیئر ساتھیوں کے ہمراہ عبدالقادر سے ملنے آیا تو ملاقات کے اختتام پر امیر نے ہلکا سا طنز کرتے ہوئے کہا: ''میں آپ کی آمد سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ آپ بڑی بہادری سے میرے ساتھ لڑے اور فتح حاصل کی۔ میں خدا کے طریقوں کا کتنا احترام کروں۔ آپ کی آمد ظاہر کرتی ہے کہ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے بھی اپنا

فرض ادا کیا، لیکن آپ خود بہترین منصف ہیں۔ آخر فرانسیسی فوج کے بہت سے افسروں پر میرا احسان ہے۔ اگر میں نہ ہوتا تو آپ کے بہت سے کرنل ابھی تک کیپٹن اور بہت سے جرنیل ابھی تک کرنل ہوتے۔''

امیر کا خواتین کے ساتھ بات کرنے کا اپنا مخصوص انداز تھا اور وہ انہیں اپنی باتوں سے متاثر کرنے اور لبھانے میں کبھی ناکام نہیں ہوتا تھا۔ جب اعلیٰ طبقے کی ایک خاتون نے سوال کیا کہ ''آپ عربوں کو آخر چار بیویوں کی ضرورت کیوں ہوتی ہے اور فرانسیسیوں کی طرح ایک پر اکتفا کیوں نہیں کرتے؟'' تو امیر نے جواب دیا: ''ہم ایک عورت سے اس کی خوبصورت آنکھوں کی وجہ سے شادی کرتے ہیں، دوسری سے ہونٹوں کی وجہ سے، تیسری سے اس کے بدن کے لیے اور چوتھی سے اس کے دل اور روح کی وجہ سے بیاہ رچاتے ہیں۔ لیکن اگر کسی واحد عورت میں یہ ساری خوبیاں اکٹھی ہوں، جیسا کہ مادام آپ کے اندر ہیں، تو پھر ہمیں کسی اور کی ضرورت نہیں رہے گی۔'' عبدالقادر نے یہ بھی کہا کہ فرق صرف اتنا ہے کہ فرانس کے مرد جو کچھ چوری چھپے کرتے ہیں، عرب مرد وہ علی الاعلان کرتے ہیں۔

امیر سے ملنے کے مشتاق فرانسیسی مردوں اور عورتوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اسے کہنا پڑا کہ ملاقات کے لیے ہفتے میں صرف دو دن مخصوص کر دیے جائیں تاکہ اسے مطالعہ، مراقبہ اور لکھنے کے لیے وقت مل سکے۔ ملنے کے خواہشمندوں کی چھانٹی کا کام بواسونے کے ذمہ تھا۔ مئی کے آخری دنوں میں دو ملاقاتی ایسے آئے جنھوں نے امیر کے اندر دوبارہ جوش و جذبہ بھر دیا۔

مقامی ہائی سکول کے ایک استاد کو بھی امیر سے ملنے کی اجازت دی گئی جس کا باپ نپولین کی جنگوں میں شرکت کر چکا تھا۔ عبدالقادر کے پاس نپولین کے بارے میں بہت سی معلومات تھیں۔ فرانسیسی سپاہی بسا اوقات اس کا موازنہ نپولین بونا پارٹ کے ساتھ کرتے تھے۔ ان دونوں میں واقعی بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ دونوں نے ایک نیا نظام قائم کرنے کی کوشش کی تھی، دونوں نے اپنے فوجیوں میں گہری وفاداری پیدا کی تھی، دونوں ہی اپنی برق رفتاری کی وجہ سے مشہور تھے اور دونوں ہی کو دھوکہ دیا گیا تھا۔ نپولین سے برطانویوں نے دغا کیا تھا جن کے حوالے اس نے خود کو

اب وہ دریا کی طرف موجود قلعے کی زمینوں پر لگے صاف ستھرے باغیچوں اور نفاست سے تراشے ہوئے پودوں میں چہل قدمی کے لیے بھی نکل جاتا تھا۔ اکثر اپنے ان ساتھیوں اور اہل خانہ کی قبروں پر ٹھہر کر ان کے کتبوں کو دیکھتا جو نمونیا کا شکار ہو گئے یا شدید ڈپریشن اور مایوسی کے عالم میں جینے کی خواہش چھوڑ بیٹھے تھے۔ اس کی سب سے چھوٹی بیوی مبارکہ اور دو بچوں خدیجہ اور احمد کی قبریں بھی وہیں قلعے کے باغیچے میں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بنی ہوئی تھیں۔ لیکن امیر نے اپنا بظاہر پرسکون انداز بہر حال برقرار رکھا ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ فرانس کی اعلیٰ فطرت کے بارے میں بات کرتا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ فرانس کو کسی ایک لمحے کی بنیاد پر نہیں پرکھنا چاہیے بلکہ اس کے لیے برسوں کا مشاہدہ درکار ہے۔ وہ ملاقات کے لیے آنے والوں سے اکثر کہتا تھا: ''اگر آپ فرانس پر پورا اعتماد ظاہر کریں تو آپ کو اس کا مکمل اجر ملے گا، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔''

دریں اثنا پارلیمنٹ میں بحث جاری تھی۔ ۲۵ نومبر کو جنرل فاوی یے (General Fabvier) نے عبدالقادر کو رہا کرنے کے لیے قرارداد پیش کی، لیکن اسے شدید مخالفت، تنقید اور شور شرابے کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ بات بعض نائبین کی سمجھ سے بالاتر تھی (جن کے خیال میں سارا شمالی افریقہ وحشیوں کا ایک ساحل تھا) کہ ان ''لٹیروں کو دیانت دار دشمن کیوں سمجھا جانا چاہیے''۔ ایک ڈپٹی نے چلا کر کہا: ''اس نے فرانسیسی قیدیوں کے ساتھ جو سلوک کیا، اس کے بعد اسے فرانس میں ملنے والی مہمان نوازی کا گلہ کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔'' جنرل شرام نے یہ کہہ کر بدعہدی کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی کہ ''دشمن کو اپنے اختیار میں موجود تمام تر وسائل کے ساتھ تباہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔'' لیکن اس پر اعتراض کیا گیا تو اس نے اپنی بات کے ساتھ ''جو ایک سپاہی کے وقار کے مطابق ہوں'' کے الفاظ کا اضافہ کر دیا۔

صدر کے لیے ابھی امیر کی رہائی کا حکم دینے کا وقت نہیں آیا تھا۔

۱۸۵۱ء کے موسم بہار میں امیر نے پہلی بار قلعے کی بند دیواروں سے باہر قدم رکھا۔ مئی میں ایک اور نئے وزیر جنگ جنرل راں دوں (General Randon) نے امیر کے لیے کیولری کا حفاظتی دستہ آمبواز بھیجا۔ بواسو نے بالآخر امیر کو منا لیا کہ اسے نہ صرف اپنی صحت کو بہتر بنانے

تلوار تباہی کا ذریعہ ہے

کھائیں۔

صدر کے جانے کے بعد امیر نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ''اس سے پہلے سب نے مجھے گرایا یا قید ہی کیا تھا، لیکن لوئی نپولین نے مجھے فتح کر لیا ہے۔''

اس نے سب رفقا کو اکٹھا کر کے انہیں یہ خوشخبری سنائی اور سب نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اگلے روز امیر نے ان بہت سے لوگوں کے نام شکریے کے خطوط لکھے جن کے بارے میں اسے پتہ تھا کہ وہ اس کی رہائی کے لیے تگ و دو کرتے رہے تھے۔

جلاوطنی میں رہتے ہوئے عبدالقادر نے جان لیا تھا کہ سیاست روح کو سکیڑ دیتی ہے جب کہ تقدس اسے لامحدود وسعت دیتا ہے۔ قرآن کی آیت: کل من علیھا فان (الرحمٰن:۲۶) کا مفہوم اس نے خود اپنی شکست اور یکے بعد دیگرے ٹوٹنے والی فرانسیسی حکومتوں سے یہ جانا تھا کہ کرہ ارض کی ہر شے لافانی ہے اور لازوال صرف خدا کی ذات اور اس کی عظمت اور شان ہے۔ تلوار کی سیاست اور تباہی و بربادی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

امیر نے عیسائیوں اور ملحدوں کی مہربانی کا تجربہ بھی کر لیا تھا اور وہ سمجھ گیا تھا کہ سیدھے اور سچے راستے بھی تعداد میں ایک سے زیادہ ہیں۔ ہاں، خدا لامحدود ہے، وہ سب پر محیط ہے اور بے نیاز ہے۔ ہاں، اس کے عاجز بندے اس کے بارے میں جزوی علم حاصل کر سکتے اور کسی حد تک اس کی عبادت کر سکتے ہیں۔ عبدالقادر کے نزدیک عقائد کی کثرتیت محض خدا کی لامحدود فطرت کی ایک جھلک اور خدا کی تعریف کرنے کے بے شمار طریقوں کا اظہار تھی۔

ان خیالات نے تحریری صورت چند سال بعد اختیار کی، لیکن مطالعہ اور غور وفکر کی مٹی میں ان کی جڑوں نے اپنی جگہ بنا لی تھی اور ان کی آبیاری اسی فرانس میں ملنے والی اچھائی کر رہی تھی جس نے کبھی اسے بہت بڑا دھوکہ دیا تھا۔ ہر مقام اور منصب کے لوگوں مثلاً دوپش، دوما، بوانسونے، اولیوی اے، خود پرنس پریذیڈنٹ، اور اس تابوت بنانے والے، سب سے اس نے خدا ترسی اور خیر سگالی کا مطلب سمجھا تھا اور وہ بھی ایک ایسی سرزمین پر جس کے لیے اب وہ ''کافر'' کا لفظ استعمال نہیں کرتا تھا۔

وحدت ادیان کا باطل فلسفہ

فرانس کو کافر کہنے سے بھی اجتناب

استصواب رائے کا اعلان کیا تھا جس سے یہ فیصلہ ہونا تھا کہ کیا فرانس کو دوبارہ سلطنت بنا دیا جائے۔ اس بار نپولین کے بھتیجے کو شہنشاہ بننا تھا۔ اس رات پیرس کا فیشن ایبل طبقہ اس نئے دور کی آمد کی پیشگی خوشی منا رہا تھا۔

آڈیٹوریم میں بیٹھے ناظرین میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ یہ بات پھیل گئی تھی کہ اوپر والی منزل پر آنے والے سفید چغوں میں ملبوس عربوں میں عبدالقادر بھی ہے۔ اونچی سوسائٹی کی بیگمات اور جرنیلوں سمیت سب نے گردنیں اونچی کر کے یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ ان میں کون سا شخص امیر عبدالقادر ہوگا۔ اوپر اد یکھنے والی سیکڑوں دور بینی عینکیں اوپر کی طرف اٹھ گئیں۔ اچانک تالیوں کی گونج سنائی دی۔ سارا مجمع کرسیوں سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور نعرے لگانے لگا: ''شہنشاہ، زندہ باد''۔ عبدالقادر ہی کی عمر کا ایک آدمی اندر داخل ہوا تھا جس کے لیے یہ نعرے لگ رہے تھے۔ قید وبند کی صعوبتوں سے وہ بھی اچھی طرح واقف تھا۔ لوئی نپولین سرخ مخملیں باکس میں جا کر بیٹھ گیا جس پر سنہرے رنگ کی تاروں سے شہد کی مکھیاں کاڑھی گئیں تھیں اور سب سے اوپر تاج بنا ہوا تھا۔

پہلے اور دوسرے ایکٹ کے درمیان لوئی نپولین کے لیے خاص طور پر ترتیب دیا گیا ایک گیت سنایا گیا جس کا مرکزی خیال تھا کہ ''شہنشاہیت میں امن ہے''۔ لوئی نپولین نے یہ نعرہ بوردو میں لگایا تھا جو فرانس کے طول وعرض میں مقبول ہو گیا تھا۔ گیت کے بعد عبدالقادر کو صدر کے باکس میں آنے کی دعوت موصول ہوئی۔ وہاں جا کر جب امیر، لوئی نپولین کے ہاتھ کو بوسہ دینے کے لیے جھکا تو اس نے ہاتھ جھٹک کر امیر کو گلے لگا لیا اور یورپی آداب کے مطابق اس کے رخسار پر بوسہ دیا۔ سارا مجمع اپنے مستقبل کے شہنشاہ کے اس فراخ دلانہ انداز پر خوشی سے جھوم اٹھا اور زور زور سے تالیاں بجانے لگا۔

شکار کی دو روزہ مہم سے واپسی پر امیر کے لیے لوئی نپولین نے سینٹ کلو (Saint Cloud) میں سرکاری طور استقبالیہ بھی دیا۔ دریں اثنا اس نے اپنے مصاحبوں کو ہدایت کی کہ وہ امیر کو پیرس کے تفریحی مقامات کی سیر کرائیں۔ سب سے پہلے اسے میڈلین لے جایا گیا جس کے ستون یونانی مندر کی طرح تھے۔ اس کی سیڑھیوں کے سب سے اوپر پادری کھڑا امیر کا منتظر تھا جس کے بازو

میں بازو ڈال کر امیر اب عبادت کے چبوترے کے سامنے کھڑا تھا۔ سارا ہجوم ششدر ہو کر امیر کو دیکھ رہا تھا جو پادری کے پہلو میں کھڑا عیسائیوں کی عبادت گاہ میں خاموشی سے دعا مانگ رہا تھا۔ گرجا گھر کے صحن سے باہر نکلتے وقت عبدالقادر نے پادری سے کہا: ''فرانسیسیوں کے خلاف جدوجہد کا آغاز کرتے وقت میرا خیال تھا کہ ان کا کوئی مذہبی عقیدہ نہیں ہے۔ اگر اپنے تعصبات کے بارے میں، میری آنکھیں پہلے ہی کھل نہ چکی ہوتیں تو آج اس گرجا گھر کا شکوہ دیکھ کر کھل جاتیں۔''

گمان یہ ہے کہ امیر کو پتہ نہیں تھا کہ میڈلین خدا کے ساتھ فرانس کے تعلقات میں آنے والے نشیب وفراز کا گواہ ہے۔ اس گرجا گھر کا سنگ بنیاد ۱۷۶۳ء میں لوئی پانز دہم کے عہد میں رکھا گیا تھا لیکن ۱۷۹۱ء میں دستور ساز اسمبلی نے اس کی تعمیر روک دی۔ اسی اسمبلی نے بادشاہ کے کم عقل جانشین لوئی شش دہم کا سر قلم کیا تھا۔ نپولین بونا پارٹ نے اس نیم تعمیر شدہ چرچ کے ڈھانچے کو آسٹرلٹز کی جنگ کے بعد ۱۸۰۶ء میں فرانسیسی فوج کی عظمت کی یادگار میں تبدیل کرنے کا حکم دیا لیکن جب روس میں مار کھانے کے بعد عوام کے جذبات اس کے خلاف ہونے لگے تو شکست خوردہ نپولین نے خدا کی ثناخوانی کے اصلی خیال کی طرف لوٹتے ہوئے اسے دوبارہ چرچ بنانے کا حکم دیا۔ لیکن ۱۸۵۲ء تک میڈلین زیادہ تر خالی ہی رہتا تھا اور اس کا استعمال رسومات کی ادائیگی اور تقریبات تک محدود تھا۔

نوتر دام (Notre-Dame) میں عبدالقادر نے شہنشاہ نپولین اول کا شاہی لبادہ دیکھا جو اسے بہت پسند آیا۔ اس کے بعد وہ کیتھڈرل ٹاورز پر گئے جہاں سے انہوں نے شہر کا نظارہ کیا۔ اس نے نپولین کا زمرے سے بنا ہوا سبز منقش سنگی تابوت بھی دیکھا اور ایک ہسپتال کا بھی دورہ کیا۔ جب وہ جنگ میں زخمی ہونے والے پرانے فوجیوں کے بستروں کے پاس سے گزرا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ موزوں الفاظ تو جیسے اس کے سامنے ہر وقت ہاتھ باندھ کر کھڑے رہتے تھے: ''میں نے نپولین کی شمشیر کو چھوا ہے اور اس کا مقبرہ بھی دیکھا ہے۔ میں اس جگہ سے جاتے وقت بہت خوش ہوتا اگر آپ میں کچھ ایسے لوگ یہاں موجود نہ ہوتے جو میرے یا میرے سپاہیوں کے ہاتھوں زخمی ہوئے ہیں۔''

امیر اور اس کے ساتھیوں نے فرانسیسیوں کی غباروں میں اڑنے کی مہارت کا مظاہرہ دیکھنے

کی ہیں جس سے ان کی رحمدلی پر زد پڑتی۔ مجھے کسی ایسے یہودی کی طرح نظر آنا قابل قبول نہیں ہے جو کاغذ کے ایک ٹکڑے کے عوض اپنی رہائی خرید رہا ہو۔" اب امیر اپنی مرضی سے صدر کو ایک تحریری بیان دینا چاہتا تھا۔

لوئی نپولین جب سینٹ کلو کے استقبالیہ کمرے میں داخل ہوا تو عبدالقادر عربوں کے رواج کے مطابق اس کے ہاتھ کو بوسہ دینے کے لیے آگے بڑھا، لیکن فرانسیسی "سلطان" نے اسے کھینچ کر گلے سے لگا لیا۔ عبدالقادر نے کاغذ کا وہ ٹکڑا اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ الفاظ تو ہوا کی طرح ہوتے ہیں لیکن تحریر مستقل ہوتی ہے:

"میں عالی جناب کے پاس آپ کی مہربانی کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔.... آپ نے مجھ پر اعتماد کیا ہے۔ آپ نے ان لوگوں کی بات سننے سے انکار کر دیا جنھیں میرے بارے میں شکوک وشبہات تھے۔ آپ نے مجھے رہا کیا اور اس طرح وہ وعدے پورے کیے جو دوسروں نے کیے تھے، لیکن ان پر کاربند رہنے میں ناکام رہے۔ میں آپ کو خدا کے نام پر اور خدا کے تمام نبیوں اور پیغمبروں کی قسم کھا کر یہ اقرار نامہ دینے آیا ہوں کہ میں کبھی آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔ میں اپنے وعدے سے کبھی نہیں پھروں گا۔ میں کبھی آپ کی مہربانی کو فراموش نہیں کروں گا اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی الجزائر واپس نہیں جاؤں گا۔"

صدر کے خیال میں یہ غیر اہم تھا، لیکن اس نے نرمی سے شکریہ ادا کر کے کاغذ لے لیا اور پھر عبدالقادر کے ساتھ محل اور اس کی زمینوں کا خود دورہ کرانے کے لیے آگے بڑھا۔ جب وہ اصطبلوں کے پاس پہنچے تو وہاں امیر نے عربی نسل کا ایک شاندار سفید گھوڑا دیکھ کر اس کی تعریف کی۔ لوئی نپولین نے کہا: "یہ گھوڑا آپ کا ہوا۔ مجھے امید ہے کہ یہ گھوڑا آپ کو یہ بھلا دے گا کہ آپ نے طویل عرصے سے گھڑ سواری نہیں کی۔ اس کی آزمائش کریں اور اس تقریب میں اس پر سوار ہو کر جائیں جو آپ کے اعزاز میں وارسائے میں منعقد ہو گی۔"

تین نومبر کا دن امیر کے دورۂ پیرس کا آخری دن تھا۔ عبدالقادر نے اپنے شائستہ اطوار سے پیرس والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا، حتیٰ کہ فرانسیسی فوج نے بھی اسے سلامی دی تھی۔ عبدالقادر کو ہوٹل

عبداللہ کی قسمیں کھا کھا کر وفاداری کا یقین دلانا

جس نے مارسایے سے روانگی کے وقت گار دے لی آں (Gare de Lyon) کے ریلوے اسٹیشن پر امیر کا آٹو گراف لیا تھا، ایسکوفی اے جس نے پو میں امیر کا محافظ بننے کی سعادت حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی، جنرل دوما جس کے بارے میں امیر کا کہنا تھا کہ ''ہر مشکل کی کنجی اور اپنے وعدوں کا غلام ہے''، فردی ناں دے لیسپس جس نے پو میں امیر سے ملاقات کی تھی اور بعدازاں نہر سوئز کے معاملے پر امیر سے اخلاقی مدد کی درخواست کی، ایمیل اولیوی اے جو پہلے ایک ریپبلیکن منتظم تھا اور جسے اب شہنشاہ نپولین سوم کا وزیراعظم بننا تھا۔

ایک پرائیویٹ اسٹیمر ''لابراڈور'' جو کبھی مرحوم مارکی دے سینٹ سیمون (Marquis de Saint Simon) کی ملکیت تھا، استنبول جانے کے لیے امیر کے حوالے کر دیا گیا۔ بواسو نے اور اس کی بیوی اب بھی امیر کے ہمراہ تھے۔ انہوں نے امیر کے خاندان کی منتقلی میں مدد کے لیے ان کے ساتھ جانے پر اصرار کیا تھا۔ استنبول سے امیر کو برسا میں اس کے نئے گھر لے جایا گیا اور اس کے لیے ایک لاکھ فرانک سالانہ مشاہرہ بھی مقرر رہا۔* (اس وقت ترکی میں فرانس کے سفیر کو پانچ ہزار فرانک تنخواہ ملتی تھی)۔ شہنشاہ کے خیال میں عبدالقادر جیسی بلند مرتبہ شخصیت کے لیے، جس کا خاندان بھی بہت وسیع ہو، کم از کم اتنی رقم ضروری تھی۔ عبدالقادر اور لوئی نپولین کے درمیان ایک دوسرے کے لیے حقیقی تحسین کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا، لیکن آخر لوئی نپولین عبدالقادر کا اتنا خیر اندیش حتیٰ کہ چاہنے والا کیوں تھا؟ شاید اس نے امیر میں وہی خوبیاں دیکھی تھیں جن کے ساتھ اس کی ایک ماضی پرستانہ قسم کی وابستگی تھی۔ ہو سکتا ہے حقیقت پسندانہ سیاست اور رومانویت کو ساتھ لے کر چلتے ہوئے لوئی نپولین یہ سمجھتا ہو کہ احسان کے بوجھ تلے دبا ہوا امیر فرانس کے لیے فائدہ مند اور شان و شوکت کے حصول میں اس کے لیے مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

لیکن ملک سے باہر جاہ وجلال قائم کرنے، ملک کے اندر خوشحالی لانے اور مزدور طبقے کے

---

*اس مشاہرے یا پنشن کا تعین اس وقت کیا گیا تھا جب جنرل راں دوں لوئی نپولین کا وزیر جنگ تھا۔ یہ رقم امیر کی اس وسیع خاندانی جائیداد کے نقصان کی تلافی تھی جس پر فرانسیسیوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ سالانہ مشاہرہ امیر کے وارثوں کو ۱۹۵۴ء تک ادا کیا جاتا رہا۔ طویل عرصے تک ادا کی جانے والی یہ رقم ظاہر کرتی ہے کہ امیر نے فرانس میں اپنے لیے کتنی نیک تمنائیں کمائی تھیں۔

حالات بہتر بنانے کے لیے لوئی نپولین کے پاس، جواب شہنشاہ نپولین سوم بن چکا تھا، کوئی ایسا قطب نما نہیں تھا جس سے وہ صنعتی انقلاب کی نئی قوتوں اور حکومت میں سب کو مزید نمائندگی دینے کے عوامی مطالبوں کے ساتھ پنجہ آزمائی کرتے ہوئے معاشرے میں پڑ جانے والی گہری دراڑوں اور بھول بھلیاں کے بیچ میں کوئی راستہ تلاش کر سکتا۔ اس کا فرانس کی عظمت رفتہ بحال کرنے کا خواب ایک حقیقت کے ادراک میں تبدیل ہو چکا تھا جس کا اظہار اس نے قید کے دوران لکھی گئی اپنی ایک تحریر میں کیا تھا: ''طبقات کی حکومت کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اب آپ صرف عوام کی طاقت سے حکومت کر سکتے ہیں۔'' اس کے نتیجے میں لوئی نپولین نے خارجہ پالیسی کے میدان میں یکے بعد دیگرے کئی فاش غلطیاں کیں، کیونکہ اس نے یہ فرض کر لیا تھا کہ نئی ترتیب میں منظم ہونے والے عوام کو صرف قومی عظمت کی ضرورت ہے۔

امیر کے پاس تو صرف ایک ہی سمت نما تھا اور وہ تھا اسلام۔ تنگ نظری پر مبنی فرقہ وارانہ اسلام نہیں بلکہ اس سے کہیں وسیع تر اسلام، فطرت کا اسلام، ہر اس جاندار کا اسلام جو خدا کے قانون کے آگے سر جھکا دے۔ امیر کا اسلام ایک ایسے خدا پر یقین رکھتا تھا جو ''عظیم تر'' تھا، جو اس کے حقیر بندوں اور اسلام سمیت اس کے کسی بھی مذہب کے تصور سے بھی عظیم تھا۔ ''ہر شخص اسے اپنے مخصوص انداز میں جانتا اور اس کی عبادت کرتا ہے اور وہ دوسرے طریقوں سے مکمل طور پر لاعلم رہتا ہے۔'' دوسرے لفظوں میں ہم سب غلط ہیں۔ اب عبدالقادر کے ذہن پر صرف ایک ہی دھن سوار تھی کہ خدا کی وحدانیت کو ان طریقوں کے تنوع کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے جن سے اس کے پیدا کیے ہوئے بندے اس کی عبادت کرتے ہیں۔ پیرس میں اس سے ملاقات کے لیے آنے والے ایک شخص نے اس کے ان تصورات کو مزید نکھارنے کے لیے مہمیز کا کام کیا تھا جو آمبواز سے اس کے ذہن میں پرورش پا رہے تھے۔

ایشین سوسائٹی آف پیرس کا صدر مانسیے رینار (Monsieur Reinard) ان معدودے چند لوگوں میں شامل تھا جنھیں عبدالقادر سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ مشرق کے سکالرز اور اس کے چاہنے والوں کی اس بین الاقوامی برادری کی طرف سے اس نے امیر سے پوچھا کہ کیا وہ کبھی

وحدت ادیان کا فریبی فلسفہ

حالات کے حوالے سے کیے جاتے ہیں۔ جس طرح ایک ڈاکٹر اپنا نسخہ تبدیل کر سکتا ہے، بالکل اسی طرح مذہبی قانون بھی بدلا جا سکتا ہے۔''

بہر حال عبدالقادر نے اپنے قارئین کو یاد دلایا کہ خدا جو چاہے کر سکتا ہے۔ وہ کسی قانون کو بغیر کوئی وجہ بتائے لاگو یا منسوخ کر سکتا ہے۔ کوئی قانون کتنا عرصہ نافذ رہے گا اور کب منسوخ کیا جائے گا، اس کا تعین صرف خدا کی دانش کرتی ہے۔

''یہودی حضرت عیسیٰ پر اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے ان کے قوانین منسوخ کر دیے تھے لیکن مسیح کی تعلیمات میں تو قانونی ضابطے کے بارے میں کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ اس کی بجائے انہوں نے صرف اقوال اور خطبے پیش کیے ہیں: میں شریعت کو بدلنے نہیں آیا، بلکہ اس پر عمل کرانے آیا ہوں۔ مسیح کا یہودیوں کے لیے ردعمل بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ مسلمانوں کا عیسائیوں کے لیے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر کہا تھا کہ میں عہد نامہ قدیم یا موسیٰ کی شریعت کو منسوخ کرنے نہیں بلکہ اسے مزید کامل بنانے آیا ہوں۔ موسوی شریعت کا تعلق عمومی طور پر انسان کے خارجی رویے سے تھا۔ عہد نامہ انسانوں کے دلوں کی بات کرتا ہے۔''

عبدالقادر دوبارہ بات شروع کرتا ہے: ''موسیٰ کی دانش کی بنیاد عمل پر ہے اور اس کا تعلق ذمہ داریوں اور پابندیوں سے ہے۔ یسوع مسیح کی دانش کا تعلق روح سے ہے اور یہ بلند تر سچائیوں تک پہنچنے کے لیے نفسانی خواہشات سے انکار کی دعوت دیتی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دانش میں یہ دونوں خاصیتیں اکٹھی ہو گئی ہیں۔ انبیا کا اختلاف محض چند اصولوں کی تفصیلات پر ہے۔ ان کی مثال ایسے افراد کی سی ہے جن کا باپ ایک ہی ہو، لیکن انہوں نے مختلف ماؤں کے بطن سے جنم لیا ہو۔''

''یہ بہت سے تیروں میں سے ایک تیر ہے جو فضا میں چھوڑا گیا ہے۔'' یہ تبصرہ امیر نے ایشیاٹک سوسائٹی کے صدر کو بھیجے گئے اپنے مسودے پر کیا تھا۔ تیر عین نشانے پر لگا۔ نو جولائی ۱۸۵۵ء کو فرانس کے بڑے روزانہ اخبار لے مونیٹیر یونیورسل (Le Moniteur Universel) نے امیر کے مضمون کا خلاصہ شائع کیا جس نے پیرس کے دانشوروں کو اتنا متاثر کیا کہ معروف ماہر عربیات گستاو دوگا (Gustave Dugat) نے سوچا کہ ''ہوا میں اڑتے اس تیر'' کو مکمل طور پر پیش

کلمة حق ارید بها الباطل ←

مسجد کو چرچ بنایا جا سکتا ہے۔

جس طرح امیر کے لیے الجزائر میں فرانس کے قبضے کے خلاف جدوجہد میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ اس کے اپنے ساتھی تھے، اسی طرح الجزائر میں دوپش کے سب سے بڑے مخالف عرب نہیں بلکہ کلیسا کے مخالف فرانسیسی تھے جنھیں اپنی بدنیتی یا جہالت کی بنا ڈر تھا کہ مسیح کے چاہنے والے پادری اپنی صلیبوں اور کنواری مریم کے مجسموں سے مسلمانوں کو ناراض کر دیں گے۔ اپنے کلیسا مخالف تعصبات کے اسیر ان لوگوں کو خبر نہیں تھی کہ ۱۸۳۱-۳۲ء میں افریقہ جانے والی فوج کے سپہ سالار ڈیوک آف روویگو نے جب الجزائر کے مفتی سے پوچھا تھا کہ کیا وہ ان کی ایک مسجد کو چرچ میں تبدیل کر لے تو اسے کیا جواب ملا تھا۔ مفتی نے خفا ہونے کی بجائے انتہائی مدبرانہ جواب دیا: ''خدا ہم پر اپنی رحمت کرے۔ خدا کرے افریقہ خوش و خرم رہے۔ فرانسیسیوں پر اب یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ خدا پر یقین نہیں رکھتے۔ آپ کو جو مسجد بھی موزوں لگے، لے لیں۔ عبادت کا طریقہ مختلف ہو سکتا ہے، لیکن معبود نہیں، کیونکہ عیسائیوں کا خدا ہمارا بھی خدا ہے۔ ہمارے درمیان فرق صرف اس طریقے کا ہے جس سے ہم خود کو اس کے ساتھ منسلک کرتے ہیں۔''

جلاوطنی کے دوران امیر نے اسی مفتی کے افکار کو ذرا مختلف انداز میں بیان کیا تھا: ''ہمارا خدا اور ان تمام برادریوں کا خدا جو ہم سے مختلف ہیں، درحقیقت ایک ہی ہے۔..... مسلمانوں پر اس نے خود کو اس انداز میں منکشف کیا جو تمام شکلوں اور صورتوں سے بالاتر ہے۔..... عیسائیوں کے لیے وہ یسوع مسیح کی شکل میں ہے۔..... اس نے بتوں کی پوجا کرنے والوں پر بھی خود کو ظاہر کیا ہے اور وہ بھی دراصل اسی کی پرستش کرتے ہیں، کیونکہ کوئی بھی انسان ان فانی چیزوں کی پوجا نہیں کر سکتا۔''

چوالیس سال کی عمر میں عبدالقادر کی جلاوطنی میں شروع ہونے والی نئی زندگی مطالعہ، تدریس اور مراقبے پر مشتمل تھی جس کا مقصد سکون کے ساتھ خالق حقیقی سے جا ملنے کا انتظار کرنا تھا۔ تاہم اس سب سے بڑے دانشمند کا منصوبہ کچھ اور ہی تھا جسے روبہ عمل کرنے کے لیے قدرت اور طاقت کی سیاست اس کے ہتھیار تھے۔

بتوں کو پوجنے والے دراصل اللہ تعالیٰ کی پرستش کرتے ہیں۔

دل والے آتے ہیں اور یہ صرف عارضی نوعیت کے امراض کا علاج کرنے کے لیے مفید ہے۔ اپنی انسانیت کی تکمیل دوسروں کے ساتھ اکٹھے رہنے سے ہوتی ہے۔" باہر کے دشمن کے خلاف کم تر درجے کی جنگ انہیں اپنے اندر کے دشمن کے ساتھ جاری زیادہ اہم جنگ سے غافل نہیں کرتی۔ ان کی زندگیاں اس دنیا کے امور کو ابدی زندگی کے معاملات کے ساتھ مربوط کر لیتی ہیں۔" امیر کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا، لیکن بہت کم یورپی سفارت کار اس بات کو سمجھ پائے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ فرانسیسی حکومت کی مدد سے عبدالقادر نے زرعی زمینیں حاصل کر لیں تا کہ اپنے الجزائری لوگوں کی مدد کے لیے پیسے کمائے جائیں۔ پھر ایک وقت آیا جب وہ اتنی بڑی زرعی جاگیر کا مالک بن گیا جو مغرب میں بحیرہ طبریہ (Sea of Galilee) تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے دمشق اور بیروت کے درمیان پل تعمیر کرایا اور جیمز روتھ شیلڈ کی شراکت سے محصول چونگی بھی قائم کی۔ دنیاوی سرگرمیوں سے قطع نظر، امیر کا دل اپنی کتابوں، اپنے شاگردوں اور اپنے مذہبی معمولات میں ہی اٹکا رہتا تھا۔ عربوں کی نظر میں اس کے سر پر تین تاج تھے: آل رسول، مذہبی عالم اور جنگجو شہزادہ۔

ترک سرکار عبدالقادر کو شک وشبے کی نظر سے دیکھتی تھی۔ وہ اور اس کے الجزائری ساتھی فرانس جیسے دیو کے حفاظتی پروں کے نیچے تھے، یہاں تک کہ ان کی سرکاری حیثیت بھی واضح نہیں تھی۔ کیا انہیں فرانسیسی شہری سمجھا جائے، سلطنت عثمانیہ کے محکوم یا محض حکومت کے معزز مہمان؟ امیر نے تو خاموشی سے خود کو سیاسی طور پر "نامرد" بنا لیا تھا، لیکن اس کے باوجود جس طرح عرب اس کے پرستار تھے، اس سے ترک حکومت کو اب بھی ایک سیاسی پیغام ملتا تھا جو عدم تحفظ کا شکار اور عرب قوم پرستی ابھرنے کے خدشے سے دوچار تھے۔

کریمیائی جنگ کا باضابطہ اختتام ۱۸۵۶ء کے موسم بہار میں ہوا۔ ان دنوں عبدالقادر عمارہ ڈسٹرکٹ میں اپنی تیس کمروں پر مشتمل دو منزلہ رہائش گاہ میں منتقل ہو رہا تھا۔ یہ عمارت کسی زمانے میں عبدالقادر کے روحانی استاد ابن عربی کی اقامت گاہ بھی رہی تھی۔ تین مکانوں کو ملا کر ایک مکان میں تبدیل کی جانے والی یہ عمارت سامنے سے فٹ بال کی گراؤنڈ جتنی چوڑی تھی اور اس کے

مشہور فلسطین دشمن یہودی سرمایہ دار کی مدد سے تعمیری منصوبہ

عیسائیوں اور یہودیوں کی قانونی حیثیت میں یہ مجوزہ تبدیلی بذات خود مسلمانوں کے نزدیک توہین کے مترادف تھی۔ پیغمبر کی حدیث سے اخذ کیا ہوا لفظ ''ذمہ'' پہلے ہی اقلیتوں بالخصوص اہل کتاب کی حفاظت اور احترام کو ان کے ایمان کا حصہ بنا چکا تھا۔

ان اصلاحات کے بارے میں عبدالقادر کی کیا رائے تھی؟ اس کی غیر سیاسی شخصیت اسے اپنی آرا سر عام ظاہر کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ لیکن بہر حال اس بات سے کسی کو انکار نہیں تھا کہ اس کی روایت پسندی اور فطری اسلامی طبیعت نے اسے شریعت کا محافظ بنا دیا تھا۔ مارچ ۱۸۵۶ء میں بلڈ نے وزارت جنگ کو جو رپورٹ بھیجی، اس میں لکھا تھا کہ امیر بادل نخواستہ تبدیلی کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے۔ ''اس کی اندرونی کیفیت کا صحیح اندازہ لگانا تو ممکن نہیں لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ اگر اس کا دل عیسائیوں اور یہودیوں کو مسلمانوں کے برابر درجہ دینے کے خلاف ہو، تب بھی وہ یہ جانتا ہے کہ ہر قانون ضرورت کی بنیاد پر بنتا ہے۔ مذہب کے بارے میں امیر کی سمجھ بوجھ سے واقف ہونے کی وجہ سے میرا گمان ہے کہ اسے افسوس اس وقت ہوتا ہے جب وہ یہ سوچتا ہے کہ ساتویں صدی (کے ذہنی ماحول) میں رہنے پر اصرار کی صورت میں اسلام ازم کا مستقبل کیا ہوگا۔ وہ اکثر کہتا ہے کہ ''مسلمانوں یعنی حقیقی مسلمانوں کے فقدان کی وجہ سے اسلام دم توڑ رہا ہے۔''

مجوزہ اصلاحات سے عیسائیوں اور یہودیوں کو مسلم عدالتوں میں شہادت دینے کی اجازت مل گئی اور انہیں تمام حکومتی اور بلکہ خاص طور پر فوجی عہدوں تک یکساں رسائی بھی دے دی گئی۔ فوج میں ملازمت کرنے کا حق ملنے سے یہودیوں اور عیسائیوں کی اس خصوصی ٹیکس سے جان چھوٹ گئی جو عسکری خدمات انجام نہ دینے پر ان سے وصول کیا جاتا تھا۔ ان کے اندر حقیقت میں فوجی ملازمت کرنے کی خواہش اگرچہ نہیں تھی، لیکن وہ اپنے یورپی سرپرستوں سے اس ٹیکس کی شکایت اکثر کرتے رہتے تھے۔ لیکن اصلاحات کا اعلان کرنا ایک چیز تھی اور انتشار کا شکار سلطنت عثمانیہ میں انہیں عملی طور پر نافذ کرنا دوسری بات!

۱۸۶۰ء کے موسم بہار تک لبنان میں بدامنی شدید صورت اختیار کر چکی تھی۔ حکومت عثمانیہ نے اصلاحات کا اعلان ۱۸۵۶ء میں کیا تھا، لیکن چار سال گزرنے کے بعد بھی عملی طور پر اس ضمن میں

بہت کم پیش رفت ہوئی تھی۔ ترک حکومت دو طرف سے پھنسی ہوئی تھی۔ ایک طرف یورپ دباؤ ڈال رہا تھا کہ وہ اپنے قوانین کو متحدہ یورپ کی رکنیت کے معیار کے مطابق جدید بنائے جب کہ دوسری طرف مقامی اکابرین غیر مسلموں کے لیے ''ذمہ'' اور اس کے ساتھ ہی حکومتی آمدنی کا ایک ذریعہ بھی ختم کیے جانے پر آنکھیں دکھا رہے تھے۔ یورپ کے کاروباری انداز اور حقارت آمیز رویے کا نتیجہ ترکی کے غم و غصے میں اضافے کے سوا کچھ نہیں نکلا اور استنبول نے سارا معاملہ ان زعما پر ڈال دیا جو روایتی طور پر پاشا کی سطح کی جاگیریں سنبھالنے کے ذمہ دار تھے اور جن کا رویہ یورپ کی خفگی کی صورت میں تبدیل ہو سکتا تھا۔ لبنان کے امیروں، آغاؤں اور پاشاؤں کا رویہ بھی سلطنت کے دیگر علاقوں سے مختلف نہیں تھا۔ سبھی نے اصلاحات کو نظر انداز کر دیا۔

فروری ۱۸۵۶ء کی اصلاحات اور ترکی کے دفاع میں اتحادی ممالک کی فتح سے شہ پا کر لبنان میں مارونیوں نے جزیہ دینا بند کر دیا اور ان ملازمتوں کا مطالبہ بھی کر دیا جو پہلے ان کے لیے شجر ممنوعہ تھیں۔ اپنے یورپی سرپرستوں کی حمایت پر تکیہ کرتے ہوئے عیسائیوں نے غیر ضروری تکبر ظاہر کرنا شروع کر دیا اور کریمیائی جنگ کے دوران علی الاعلان یہ کہنے لگے کہ سلطنت عثمانیہ ختم ہو چکی ہے اور جلد ہی عالمی طاقتیں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گی۔ ان کا خیال درست تھا، لیکن اس کے اظہار کا وقت غلط تھا۔

ترک حکام عیسائیوں کے ٹیکس نہ دینے کے فیصلے پر آگ بگولا ہو گئے۔ انہیں فوج میں عیسائیوں کو بھرتی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ انہیں فی کس سالانہ دس شلنگ ٹیکس چاہیے تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اب عیسائیوں کو ''ٹھیک'' کرنے کی ضرورت ہے۔ عیسائیوں کو اس مشرقی اصطلاح کا اچھی طرح پتہ تھا جو عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں پر یکساں لاگو ہوتی تھی۔

لبنان میں ترکوں نے (مسیحیوں کی) ''اصلاح'' کے اس عمل کے لیے دروزوں کو استعمال کیا۔

مغربی طاقتوں کی شہ پر عیسائیوں کا معمولی ٹیکس سے انکار اور مجاہد موصوف کا ان کے دفاع میں جہاد، یہ ٹیکس سالانہ دس شلنگ تھا۔

— ۲۳ —

''کافروں'' کے دفاع میں جہاد

ہر طرف بہت بری افواہیں گردش کر رہی تھیں۔ تفصیلات بہت کم دستیاب تھیں، لیکن جب اڑتی اڑتی کچھ باتیں امیر کے کانوں تک پہنچیں تو وہ لرز کر رہ گیا۔ عیسائیوں کو اپنے کیے کا پھل بہت جلد ملنے والا تھا۔ ۵ مارچ ۱۸۶۰ء کو دمشق کے گورنر احمد پاشا نے اپنے محل میں کئی مقامی رہنماؤں کی میٹنگ طلب کی جس کے بارے میں بعد میں پتہ چلا کہ اس کا مقصد ''ذمہ'' کا قانون ختم کرنے والی اصلاحات کو بے اثر کرنا تھا۔ جن لیڈروں کو اجلاس میں مدعو کیا گیا تھا، ان میں دو دروز سرداروں سعید بے جنبلاط اور ولد العطرش کے علاوہ دمشق کے مفتی بھی شامل تھے۔ دروزوں نے لبنان میں پہلا مرحلہ مکمل کرنا تھا جہاں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ٹیکسوں اور مساوی حقوق کی نئی اصلاحات پر پہلے ہی ہر روز فسادات ہو رہے تھے۔ دمشق کا دھیان رکھنا احمد پاشا نے اپنے ذمے لیا تھا۔ اگر دمشق میں شورش کا آغاز ہوا تو ان کا خیال تھا کہ درستی کا عمل خود بخود حمص، حلب، لاذقیہ اور ایسے دیگر علاقوں تک پھیل جائے گا جہاں عیسائی آبادی رہتی ہے۔

عبدالقادر نے فرانس کے قائم قام قونصل لانوزے سے ملاقات کی۔ لانوزے ماہر عربیات تھا اور امیر کے فرانسیسی مداحوں کے غیر سرکاری ''حلقہ قادریہ'' کا رکن تھا۔ اسے امیر پر اتنا اعتماد تھا کہ اس نے فوراً دیگر ممالک کے سفیروں کو اکٹھا کر کے میٹنگ کی اور سب نے احمد پاشا سے مل کر زیر گردش افواہوں کے بارے میں براہ راست بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ پرسکون تاثرات والے گورنر

جزیہ کے منکر باغی عیسائیوں کے تحفظ میں سرگرمی

قائم فرانسیسی سفارتخانے گیا جہاں امیر کا آغا قارہ محمد اور چالیس سے زائد مسلح الجزائری لانوزے اور اس کے عملے کی حفاظت کر رہے تھے۔ یہ انتظام امیر نے کسی ہنگامی صورتحال کے پیش نظر پہلے ہی کر دیا تھا۔ اپنے فرانسیسی سرپرستوں کی سلامتی کے بارے میں مطمئن ہونے کے بعد امیر دمشق کے مفتی کے پاس گیا تا کہ اسے اپنے اور اس کے مذہب اسلام کا واسطہ دے کر عیسائیوں کا تحفظ کرنے کی ذمہ داری پوری کرنے پر قائل کرے، لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو ملازمین نے بتایا کہ مفتی موصوف سو رہے ہیں اور انہیں بے آرام نہیں کیا جا سکتا۔

تب ہی عبدالقادر کو یہ بھی پتہ چل گیا کہ جن ترک دستوں کو عوام کا تحفظ کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی، انہیں فصیل کے اندر ہی رہنے کا حکم دیا گیا تھا اور فسادات کے دوران جب گھروں کو جلایا اور عیسائیوں کو قتل کیا جا رہا تھا تو وہ خاموش بیٹھے تماشا دیکھ رہے تھے۔ عبدالقادر جب واپس فرانس کے سفارتخانے پہنچا تو دیکھا کہ اس کا گھیراؤ کرنے والا ہجوم مزید بڑا اور خطرناک ہو گیا ہے۔ اس پر عبدالقادر نے لانوزے کی حفاظت کا ذمہ اپنے اوپر لیتے ہوئے کہا:

''آپ ہمیشہ کہتے تھے: ''جہاں فرانس کا پرچم ہے، وہیں فرانس ہے''۔ آپ اپنا جھنڈا ساتھ لیں اور اسے میرے گھر پر نصب کر دیں۔ میرا گھر فرانس بن جائے گا۔ آپ اور آپ کا عملہ میرے مہمان ہوں گے اور پھر میں اپنے سپاہیوں کو، جو اس وقت یہاں آپ کی حفاظت کر رہے ہیں، دیگر عیسائیوں کے تحفظ کے لیے بہتر طریقے سے استعمال کر سکوں گا۔''

جب لانوزے وہاں پہنچا تو اسے وہاں روسی، امریکی، ڈچ اور یونانی سفارت کار بھی ملے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے اس وقت لانوزے کا بہت مذاق اڑایا تھا جب وہ عام لوگوں کی نفسیات کو سمجھنے میں عبدالقادر کی صلاحیت پر یقین رکھتے ہوئے بار بار گورنر سے ملنے کی کوشش کر رہا تھا۔

دس جولائی کی ساری سہ پہر عبدالقادر نے عیسائی بستیوں میں مچی بھگدڑ میں اپنے دو بیٹوں کے ساتھ یہ چلاتے ہوئے گزاری کہ: ''عیسائیو! میرے ساتھ آؤ۔ میں عبدالقادر ہوں، محی الدین کا بیٹا، الجزائری! میرا اعتبار کرو۔ میں تمہاری حفاظت کروں گا۔'' کئی گھنٹے تک امیر کے الجزائری باشندے متذبذب عیسائیوں کو لے جا کر حارۃ النقیب میں اس کے قلعہ نما گھر چھوڑ کر

الجزائریوں کی حفاظت میں فصیل کے اندر پہنچا دیا جائے، لیکن نقیب ایلی میں ٹھنسے ہوئے ہجوم کے کانوں میں جب اس فیصلے کی بھنک پڑی تو انہوں نے خوش ہونے کی بجائے واویلا مچانا شروع کر دیا: ''ہمیں یہیں اپنے ہاتھوں مار ڈالو! ہم پر رحم کرو! ہمیں یوں زندہ ان جلادوں کے حوالے مت کرو!''

سو افراد پر مشتمل پہلا گروپ اڑ گیا کہ وہ نہیں جائے گا، لیکن جب روس کے سفیر نے ضمانت کے طور پر ساتھ جانے کی حامی بھری تو لوگ مان گئے۔ جب ان کے بخیر وعافیت وہاں پہنچنے کی اطلاع ملی تو باقی سب بھی تعاون کرنے لگے۔ حالات معمول پر آنے کے بعد ایک روز امیر نے افسردگی کے ساتھ ایک فرانسیسی افسر سے کہا: ''ان کے لیے اتنا کچھ کرنے کے باوجود انہیں اب بھی یقین ہے کہ میں انہیں ان قصائیوں کے حوالے کر سکتا ہوں۔''

سب لوگوں کو قلعے میں منتقل کرنے کے بعد جب امیر کی رہائش گاہ خالی ہو گئی اور اس کی صفائی بھی کر دی گئی تو اس نے اعلان کرایا کہ جو کوئی بھی عیسائیوں کو اس کی رہائش گاہ پر پہنچائے گا، اسے ہر عیسائی کے بدلے پچاس پیاسترانعام دیا جائے گا۔ پانچ دن تک امیر کو سونے کا موقع بھی بہت کم ملا۔ جب تھوڑا سا وقت ملتا تو وہ گھاس پھونس سے بنی اسی چٹائی پر لیٹ کر آنکھ لگا لیتا جہاں بیٹھ کر وہ سارا دن پاس رکھی بوری میں سے رقم نکال کر تقسیم کرتا رہتا تھا۔ جونہی ایک سو عیسائی اکٹھے ہو جاتے، الجزائری سپاہی انہیں لے جا کر قلعے میں چھوڑ آتے۔

بعض سربرآوردہ عیسائی افراد مناسب جگہ کا انتخاب ہونے تک کئی ہفتے امیر کی رہائش گاہ پر ہی رکے رہے۔ آخرکار امیر اور اس کے ساتھی تین ہزار عیسائیوں کا ایک قافلہ لے کر بیروت گئے۔ ان میں بلڈ خاندان کے لوگ بھی تھے جو اس سارے قتل عام کے دوران امیر کی پناہ میں رہے تھے۔

جارج بلڈ ان میں نہیں تھا۔ ۱۸۵۷ء میں جب جارج نے محسوس کیا کہ اس نے عبدالقادر کا اعتماد کھو دیا ہے تو اس نے وزارت سے درخواست کی کہ اسے واپس بلا لیا جائے۔ ان کے باہمی تعلقات میں سردمہری آ گئی تھی۔ اگرچہ یہ واضح نہیں ہے کہ ایسا کیوں ہوا، لیکن ہو سکتا ہے کہ امیر بلڈ کے اشاروں پر چلتے چلتے تنگ آ گیا ہو اور قونصل خانے میں فرانسیسی سفارت کاروں سے براہ

سلطنتِ عثمانیہ کے باغی عیسائیوں کی حفاظت کا کارنامہ

اہم شخصیات کو عیسائیوں کو درپیش خطرے کے بارے میں فعال طریقے سے خبردار کرنے کی کوشش کی۔..... سارے بحران کے دوران امیر کا رویہ قابل تحسین تھا۔ اس نے عام لوگوں کی سلامتی کو یقینی بنانے کے لیے دن رات ایک کر دیا جو انسانیت کے لیے اس کی جاں نثاری اور قربانی کے جذبے کا ثبوت ہے۔''

اگست میں اخبارات و جرائد نے مزید مضامین شائع کیے جو سبھی امیر کی مدح میں تھے۔ لاگزٹ دے فرانس (Le Gazette de France) نے بڑے جوش سے لکھا تھا کہ ''امیر نے شام کے عیسائیوں کو حوصلہ مندی سے تحفظ فراہم کر کے خود کو لازوال بنالیا ہے۔ انیسویں صدی کی تاریخ کے سب سے خوبصورت صفحات میں سے ایک صفحہ امیر سے منسوب ہوگا۔'' لے پے ای جورنال دے لان پائر (Le Pays, Journal de l'Empire) نے لیزرسٹس (مقدس لیزرس سے منسوب ایک مسیحی گروہ کے افراد) کے حوالے سے لکھا تھا: ''جب خون کی ہولی اپنے عروج پر تھی، تب امیر گلیوں ایسے میں نمودار ہوا جیسے اسے خدا نے بھیجا ہو۔'' فرانس کا سارا پریس اسی طرح کی خبروں اور تحریروں سے بھرا پڑا تھا۔ بیس اکتوبر تک یہ اطلاعات امریکہ بھی پہنچ گئیں اور نیویارک ٹائمز نے اپنے مخصوص رجزیہ انداز میں لکھا: ''بیس سال پہلے عرب امیر عالم مسیحیت کا دشمن تھا اور اس کے آبائی علاقے کی پہاڑیوں میں اس کا شکار کیا گیا، لیکن اب ساری عیسائی دنیا اسلام کے اس معزول شہزادے کی تکریم میں یک زبان ہے۔ اس انتہائی بے لوث جنگجو سورما نے اپنے قدیم دشمنوں کو، جنھوں نے اسے شکست دی اور اس کی نسل کے لوگوں، اور اس کے مذہب کو اپنا مفتوح بنایا، غیظ و غضب اور موت سے بچایا۔..... عبدالقادر کے لیے یہ یقیناً عظمت کا اور حقیقی شان و شوکت کا باب ہے۔ اس بات کو تاریخ میں رقم کرنا کوئی معمولی بات نہیں کہ مسلمانوں کی آزادی کے لیے لڑنے والا سب سے ثابت قدم سپاہی اپنے سیاسی زوال اور اپنی قوم کے ناگفتہ بہ حالات میں عیسائیوں کی زندگیوں اور حرمت کا سب سے نڈر نگہبان بن کر سامنے آیا۔ جن شکستوں نے الجزائر کو فرانس کے آگے جھکایا تھا، ان کا بدلہ بہت حیرت انگیز طریقے سے اور اعلیٰ ظرفی سے لیا گیا ہے۔''

لیکن عبدالقادر نے ایسا کیوں کیا؟ اس بات پر بہت سے لوگ متعجب تھے۔ بعض لوگوں کو حیرانی تھی کہ مسلح مزاحمت کرنے والے سابق راہنما نے اس صورتحال کو ان تکالیف کا انتقام لینے کے لیے استعمال نہیں کیا جو فرانس نے اسے اور اس کے لوگوں کو دی تھیں۔ کچھ مسلمانوں کا خیال تھا کہ امیر فرانسیسیوں کے رنگ میں رنگا گیا ہے اور اب وہ عربوں کی نسبت فرانسیسیوں کے زیادہ نزدیک ہے۔ امیر کا اپنا موقف کیا تھا، اس کی رپورٹ لان پائر نے اکتوبر میں شائع کی جس میں دو بہت سادہ سی وجوہات بیان کی گئی تھیں۔ پہلی یہ کہ وہ تو محض خدا کی منشا کے مطابق کام کر رہا تھا، اور دوسری یہ کہ اس کی انسانیت کا تقاضا بھی یہی تھا۔ اس نے کہا تھا: ''یہ ایک مقدس فرض کی ادائیگی کے مترادف تھا۔ میں تو صرف ایک کارندہ تھا۔ تعریف کرنی ہے تو اس خدا کی کرو جس نے مجھے یہ ہدایت دی، اور تمہارے سلطان کو بھی جو میرا سلطان بھی ہے۔''

باقیوں کا یہ خیال تھا کہ امیر کی مداخلت اس کے مذہب کی پکار تھی۔ کیا بلڈ نے اپنی رپورٹ میں نہیں لکھا تھا کہ امیر اکثر کف افسوس ملتا ہے کہ اسلام ''حقیقی مسلمانوں کی کمی'' کی وجہ سے دم توڑ رہا ہے؟ شاید اس مثال سے وہ دوسرے مسلمانوں کو دکھانا چاہتا تھا کہ حقیقی مسلمان ہونے سے کیا مراد ہے۔ الجزائر میں بشپ دوپش کے جانشین بشپ لوئی انتونی پیوی کی طرف سے اظہار ممنونیت کے خط کا جواب دیتے ہوئے بھی امیر نے بین السطور میں اسی قسم کی بات کی تھی۔ امیر کی اصل شخصیت اکثر اس وقت جھلکتی تھی جب وہ دوسرے مذاہب کے پیشواؤں کے نام کچھ تحریر کرتا تھا۔

''ہم نے عیسائیوں کے لیے جو کچھ بھی کیا، محض اسلام کے قانون پر ایمان رکھنے اور انسانی حقوق کا احترام کرنے کی وجہ سے کیا۔ خدا کی ساری مخلوقات اس کا کنبہ ہیں اور خدا ان لوگوں سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے جو اس کے کنبے کی بہتری کے لیے سب سے اچھا کام کرتے ہیں۔ مقدس کتابوں پر ایمان رکھنے والے تمام مذاہب کی بنیاد دو اصولوں پر ہے: خدا کی تعریف کرنا اور اس کی مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔..... محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں دردمندی اور رحم دلی کے علاوہ ہر اس بات کو عظیم اہمیت دی گئی ہے جس سے معاشرے میں اتفاق قائم رہے اور جو ہمیں نفاق سے محفوظ رکھے۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مذہب سے تعلق رکھنے والوں نے اسے

حقیقی مسلمان: جو کفار کے رنگ میں رنگ جائے اور ان کے سلطان کو اپنا سلطان کہے۔

آلودہ کر دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اب وہ راستے سے بھٹک جانے بھیڑ کی مانند ہو گئے ہیں۔ میرے لیے آپ کی دعاؤں اور خیر سگالی کے جذبات کا شکریہ۔''

پریس میں امیر کے بارے میں رپورٹیں شائع ہونے کے بعد جیسے اعزازات کا انبار لگ گیا۔ فرانس کی حکومت نے اسے لیجن آف آنر عطا کیا جب کہ روس، اسپین، سارڈینیا، پروشیا، برطانیہ، رومی کیتھولک کلیسا، ترک سلطان اور صدر لنکن کی طرف سے اعزازات سے نوازا گیا۔ صدر لنکن نے، جو خود ایک قومی سانحے کے دہانے پر کھڑے تھے، ایک روز پہلے عبدالقادر کو امریکی انداز میں تحسین کی علامت کے طور پر کولٹ برانڈ کے دو پستول بھیجے جنھیں انتہائی نفاست سے خصوصی طور پر امیر کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ انہیں لکڑی کے ایک خوبصورت ڈبے میں بند کیا گیا تھا اور اس پر یہ عبارت کندہ کی گئی تھی: ''ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر کی طرف سے عزت مآب جناب لارڈ عبدالقادر کے لیے، ۱۸۶۰ء۔''

تاہم عبدالقادر کو عزت افزائی کا سب سے قابل قدر نشان اپنے جیسے ایک حریت پسند اور چیچنیا کے مجاہد محمد شامل کی طرف سے موصول ہوا۔ شامل کو بھی روسی سامراجیت کے خلاف کئی سال جدوجہد کے بعد جلاوطن کر کے ماسکو بھیج دیا گیا تھا۔ محمد شامل نے لکھا تھا:

''تعریف اس خدا کی جس نے اپنے بندے، انصاف پسند عبدالقادر کو طاقت اور ایمان عطا کیا۔..... بے حد مبارک۔ خدا کرے اس عزت اور امتیاز کے ثمرات ہمیشہ آپ کو ملتے رہیں۔''

شامل نے ان مسلمانوں کی مذمت کی جنھوں نے عیسائیوں کے ساتھ اتنا قابل نفرت رویہ اپنایا اور اپنے مذہب کو بدنام کیا۔ ''میں ان حکام کی کور چشمی پر بھونچکا رہ گیا جنھوں نے ایسی زیادتیاں کیں اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث فراموش کر دی کہ: ''جس کسی نے بھی اپنے زیر امان رہنے والے کے ساتھ ناانصافی کی، جس کسی نے بھی اس کے خلاف کوئی غلط حرکت کی یا اس کی مرضی کے بغیر اس سے کوئی چیز لی، وہ جان لے کہ روز محشر میں خود اس کے خلاف مدعی بنوں گا۔'' آپ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا عملی نمونہ پیش کیا ہے..... اور خود کو ان لوگوں سے الگ کر لیا ہے جو ان کے اسوے کو رد کرتے ہیں۔..... خدا آپ کو ان کے شر سے محفوظ رکھے

بانی عیسائی کے تحفظ پر دنیا بھر کی طرف سے اعزازات کتاب کے آخر میں منہ مٹی تصویر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

کے لیے عربوں کو حقیقی صلاحیتوں کا مالک ایک رہنما چاہیے اور اس کے لیے عبدالقادر کا نام تجویز کیا گیا تھا۔ اس تحریر کے مطابق عبدالقادر مغرب اور مسلمانوں کو یہ سکھائے گا کہ "قرآن کے الفاظ کی صحیح تشریح کیا ہے اور ایک سچے مومن کو ان کی تعبیر کس طرح کرنی چاہیے۔" یہ کتابچہ کسی گمنام شخص نے لکھا تھا جو ہوا کے دوش پر تنکے کی طرح بہہ گیا۔

لیکن یہ پھیلایا کس نے تھا؟ فرانسیسیوں نے یا کسی عرب نے؟ استنبول میں موجود فرانسیسی سفارت کاروں کو شک تھا کہ مقامی اکابرین کا احمد پاشا کے ساتھ گٹھ جوڑ رہا تھا۔ فضا میں قوم پرستانہ سازش کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ کیا دمشق میں موجود عرب اکابرین نے، جو جابر ترکوں سے تنگ تھے لیکن ساتھی مسلمانوں کے ساتھ مل کر "اصلاح" کے پھریرے لہرا رہے تھے، احمد پاشا کے ساتھ مل کر شام کو تمام غیر ملکی طاقتوں کے اثر سے آزاد کرانے کے ارادے سے بدامنی پھیلانے کی سازش کی تھی؟ لانوزے نے احمد پاشا کو واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ عیسائیوں کے ساتھ بدسلوکی ہوئی تو فرانس مداخلت کرے گا، عثمانی حکمران معزول کر دیے جائیں گے اور فرانس کے زیر اثر شام اور مصر متحد ہوں گے۔ لیکن ان اکابرین کو پتہ تھا کہ برطانوی کبھی بھی شام پر فرانس یا مصر کا اثر ورسوخ قائم ہونے کی اجازت نہیں دیں گے۔

کچھ بھی ہو، بارسوخ لوگ اپنے مرتبے کو مزید بڑھانے کے لیے دھڑے بندیوں اور عمومی بے چینی کو ہوا دینے کی سازشیں اکثر کرتے رہتے تھے۔ ۱۸۶۰ء کی سردیوں میں جب سارا معاملہ ٹھنڈا پڑا تو سٹی کونسل میں دو طاقتور خاندانوں، میدانیوں اور العظم خاندان کی نمائندگی میں بڑی تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ میدانی دھڑے نے اپنا اثر ورسوخ کافی بڑھا لیا تھا۔ العظم دھڑے کے دو کے سوا سبھی ارکان کو زندگی کے باقی ایام قبرص کے ایک قلعے ماگوسا میں ضائع کرنے کے لیے جلاوطن کر دیا گیا۔

متبادل حکمت عملی کے طور پر لوئی نپولین کے ذہن میں کافی متنازعہ تصورات تھے جن میں الجزائر میں ایک ایسی نیم خود مختار عرب سلطنت کی تشکیل بھی شامل تھی جو مقامی ثقافت کا احترام کرے اور اسے فرانسیسی ہوس اور "تہذیب" سے بچائے۔ اس قسم کی ریاست کی بھنک پڑنے پر نوآبادکاروں

کے شدید احتجاج نے اس پر مزید غور وفکر کا سلسلہ روک دیا، کیونکہ نہ صرف یہ کہ عبدالقادر کا نام الجزائر میں آباد کیے گئے یورپیوں کے لیے ایک ہوا تھا بلکہ اس نے زندگی بھر واپس نہ لوٹنے کی قسم بھی تو کھائی تھی۔ البتہ شام کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔

جولائی میں پیش آنے والے واقعات کے بعد ''ترقی یافتہ دنیا'' میں امیر کی شہرت نئی بلندیوں کو چھونے لگی تھی اور شام کو آزاد کرانے کی تحریک کی قیادت کرنے کے لیے اس کا نام برطانیہ اور فرانس دونوں کے لیے قابل قبول ہو سکتا تھا کیونکہ دونوں ہی کوئی ایسا حل چاہتے تھے جس میں کسی کو جھکنا نہ پڑے۔ ۱۸۶۰ء کے دہشت ناک واقعات سے پہلے ان ممالک کے بعض نمائندے اس طرح کے خیالات کا تبادلہ بھی کر چکے تھے۔

سلطان کی غیر مقبول اصلاحات کے بعد بلڈ نے عبدالقادر کی سیاسی نبض پر مسلسل ہاتھ رکھا ہوا تھا اور اس کی رائے بھی امیر کے حق میں تھی۔ فرانسیسی سفارتخانے کو بھیجی گئی رپورٹوں میں اس نے تصدیق کی تھی کہ امیر فرانس اور شہنشاہ لوئی نپولین کا پکا وفادار ہے تاہم اس کے کچھ خدشات بھی تھے۔ ۱۸۵۷ء میں اس نے اپنے وزیر کو لکھا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ عبدالقادر اب بھی دل میں ایسی حسرتیں رکھتا ہو کہ مشرق وسطیٰ میں وہ کچھ کر ڈالے جو وہ الجزائر میں نہیں کر سکا۔ ''مشرق میں اور بالخصوص ترکوں سے نفرت کرنے والے جنونیوں کے حلقے میں اس کا نام بہت معتبر ہے۔ ہمیں کسی بھی صورت یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ محی الدین کے بیٹے نے ہمیشہ عرب قومیت کا خواب دیکھا ہے۔ امیر کی رائے میں یورپی ممالک کی تمام تر کوششوں کے باوجود سلطنت عثمانیہ کا قائم رہنا اب ممکن نہیں رہا۔'' وزیر کو اس حوالے سے خبردار کرنے کے بعد کہ فرانس کے معاملے میں امیر کی شرافت اور شائستگی کو اس کی تابعداری پر محمول نہیں کرنا چاہیے، بلڈ نے یہ بھی تجویز کیا تھا کہ اگر فرانس کے پاس امیر جیسا کوئی شخص ہو جو اتحادی کے طور پر سلطنت عثمانیہ کی قسمت طے کرنے میں اس کا ساتھ دے تو یہ اس کے لیے بہت فائدہ مند ہوگا۔

جولائی کے واقعات کے بعد فرانس اور برطانیہ کے سامنے یہ سوال آن کھڑا ہوا تھا کہ اب کیا کیا جائے؟ دونوں ممالک مشرق وسطیٰ میں اگرچہ ایک دوسرے کے حریف تھے، لیکن ایک ایسا

انتظام کرنے میں دونوں کا فائدہ تھا جو کسی کے مفاد میں نہ جاتا ہو۔ عملی طور پر اس کا مطلب تھا سلطنت عثمانیہ کی سالمیت کی تائید کرنا اور اس کے ساتھ ہی شام میں عیسائی اقلیتوں کی سلامتی کے لیے موزوں انتظامات کو یقینی بنانا۔ اس نئی صوبے داری کے گورنر کے طور پر انگریزوں کے ذہن میں اصلاحات کے حامی ترک وزیر خارجہ فواد پاشا کا نام تھا جس نے سبک رفتاری سے موثر کارروائی کرتے ہوئے بڑی تعداد میں سازشیوں پر کلہاڑی چلائی اور بچے کھچے مجرموں کو جلاوطن کر کے منتشر کر دیا اور اس طرح دمشق پر فرانسیسی قبضے کا راستہ روکا۔

فرانسیسیوں کے ذہن میں گورنر کے لیے یقینی طور پر عبدالقادر کا نام تھا حالانکہ برطانویوں نے یہ واضح کر دیا تھا کہ ان کے خیال میں وہ ترکوں کے لیے ناقابل قبول تھا اور اسی لیے وہ بھی اس کی مخالفت کریں گے۔

ستمبر میں وزیر جنگ بننے والے عبدالقادر کے ایک اور سابق حریف مارشل راں دوں نے شام کے حکمران کے طور پر عبدالقادر کی موزونیت کے بارے میں جنرل اوٹ پول سے رائے مانگی۔ اوٹ پول اب بھی گرمیوں میں لبنان بھیجی گئی مہم جو افواج کی کمان کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یورپی طاقتیں سارے شام پر عبدالقادر کی حکمرانی پر شاید متفق نہ ہوں، لیکن ہوسکتا ہے کہ دمشق، عکا کا علاقہ اور یہودیہ اسے دینے پر رضامند ہو جائیں۔ اس صورت میں بغداد سے لے کر مغرب کی سمت جنوبی لبنان میں دریائے لیطانی تک عبدالقادر کی عملداری قائم ہو جاتی۔ اوٹ پول کا کہنا تھا کہ لبنان کبھی بھی ایک مسلمان کو حکمران کے طور پر برداشت نہیں کرے گا، چاہے وہ عبدالقادر جیسے قد کاٹھ کی شخصیت ہی کیوں نہ ہو۔

۲۳ر اکتوبر کو اوٹ پول امیر کے روبرو کھڑا تھا۔ عبدالقادر نے ان اجلاسوں میں کبھی شرکت نہیں کی تھی جو جنرل نے مختلف زبان زد عام اسکیموں کا جائزہ لینے کے لیے منعقد کیے تھے۔

بعد ازاں جنرل نے اپنے وزیر کو لکھا: ''وہ ایک ایسے وقت میں اپنی ذات پر سمجھوتہ کرنے سے ڈرتا ہے جب ترک اس کے خاموش دشمن ہیں جب کہ دمشق کے مسلمان اس سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن بہر حال اگر لبنان کو خود مختار بنانے اور عبدالقادر کے لیے کسی قسم کا سیاسی اختیار حاصل

کرنے کی کوشش کی جائے تو بہت اچھا ہوگا۔‘‘

لیکن ان سارے اندازوں اور تخمینوں کے ساتھ ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ کسی نے بھی امیر سے یہ اجازت لینے کی زحمت نہیں کی تھی کہ اس کا نام اس سارے کھیل میں شامل کیا جائے یا نہیں۔ ۱۸۶۰ء میں دسمبر کے مہینے میں ایک فرانسیسی صحافی نے آخر یہ سوال پوچھ ہی لیا۔

’’شام کے متوقع گورنر کے طور پر فرانسیسی اخبارات میں آپ کا نام لیا جا رہا ہے۔ کیا آپ نے بھی سنا ہے؟‘‘

’’ہاں سنا ہے اور اگر میں غلطی پر نہیں تو ترکوں کی مجھ سے نفرت کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی ہے، لیکن ترکوں کو تسلی رکھنی چاہیے۔ سیاست میں میرا کیریئر اب ختم ہو چکا ہے۔ مجھے اب دنیاوی جاہ وجلال کی کوئی تمنا نہیں ہے۔ میں اب صرف خاندان کے ساتھ رہنے، عبادت کرنے اور سکون سے وقت گزارنے جیسی خوشیاں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

اپنی عمر رسیدہ ماں کو روزانہ بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگانا اور ہوا خوری کے لیے چھت پر لے جا کر کوہ قاسیون پر سورج کو ڈوبتے دیکھنا بھی ان خوشیوں میں سے ایک خوشی تھی۔ لالا زہرہ کی عمر اب سو سال ہونے کو تھی اور وہ بستر سے کبھی کبھار ہی اٹھتی تھی۔ عبدالقادر کی دانش وحکمت اور رحم دلی کا سرچشمہ سمجھی جانے والی اس خاتون کا اگلے سال انتقال ہو گیا۔

جب جنرل اوٹ پول اپنے تصور میں امیر کے مستقبل کی منصوبہ بندی کر رہا تھا تو پیرس میں فرانسیسی میسونی لاج ’’ہنری چہارم‘‘ کی ایک کمیٹی بڑی احتیاط سے امیر کے نام ایک خط تیار کر رہی تھی اور اس کے ساتھ موزوں عبارت والا ایک قیمتی زیور بھی منتخب کیا جا رہا تھا۔ تقریباً ایک مہینے کی عرق ریزی کے بعد سولہ نومبر کو میسونی تنظیم کی علامت سے ڈھکے سبز جڑاؤ تمغے کے ہمراہ یہ خط ’’انتہائی عزت مآب جناب عبدالقادر‘‘ کی خدمت میں ڈاک سے روانہ کر دیا گیا۔ تنظیم کا نشان دائرے کے اندر دو چوکھٹوں پر مشتمل تھا جس سے ایک ہشت پہلو شکل بنتی تھی جس سے روشنی کی شعاعیں خارج ہو رہی تھیں۔ عین درمیان میں فیثا غورث کی مساوات کندہ تھی۔

لاج نے خط میں اپنا تعارف کرانے کے بعد تفصیل سے بتایا تھا کہ فری میسن تنظیم کا رکن بننے

بدنام زمانہ یہودی تنظیم کی طرف سے اعزازی شمولیت کی دعوت

کے لیے کون سی صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں۔'' جہاں کہیں بھی رواداری اور انسانیت کا تحفظ ہو اور اس کی عظمت بلند کی جائے، فری میسن ان لوگوں کو شناخت کرنے کی کوشش کرتی ہے جو عظیم قربانی دیتے ہوئے اس زمین پر خدا کا سونپا ہوا کام کرتے اور مظلوموں اور ضرورت مندوں کی طرف بے لوث مدد کا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔'' خط لکھنے والوں نے عبدالقادر کا موازنہ دیگر عظیم مسلم شخصیات کے ساتھ کرتے ہوئے کہا: ''فری میسن نے، جو ایک اخلاقی خدا پر اور روح کی لافانیت پر یقین رکھتی ہے..... رواداری اور عالمی برادرانہ محبت کے رجحانات کا پرچار کرتی ہے، بھرپور جذبات کے ساتھ اس عظیم نمونے کو دیکھا ہے جو آپ نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ جو کوئی بھی اس تنظیم کے باوقار نصب العین ''سب کا ایک ہی خدا'' کے مطابق اتنا اچھا عمل کرے، تنظیم اسے فوراً شناخت کرتی اور اپنا ہی آدمی سمجھتی ہے۔'' مسجع و مقفع انداز میں لکھی گئی عبارت کے آخر میں امیر کو تنظیم کا رکن بننے کی دعوت دی گئی تھی کیونکہ ''بہت سے دل ایسے ہیں جو آپ کے دل کے ساتھ دھڑکتے ہیں، بہت سے بھائی ایسے ہیں جو آپ کو اپنا سمجھتے ہوئے آپ سے محبت کرتے ہیں اور اگر وہ آپ کو اپنی تنظیم کا رکن شمار کر سکیں تو انہیں بہت فخر ہوگا۔''

انیسویں صدی کے وسط میں فری میسن اعلیٰ اور ممتاز دماغوں پر مشتمل بین الاقوامی تنظیم تھی جو دیگر انسانوں کے ساتھ یکجہتی اور ہم آہنگی قائم کرنے کے لیے وقف تھی۔ اس کے ڈانڈے قرون وسطیٰ میں تاجروں اور اہل حرفت کی انجمنوں کے نظام سے ملتے تھے جب یہ انجمنیں مختلف رسوم ورواج، ضوابط اور کاروباری علم کے مطابق تعلیمی سرگرمیاں منظم کیا کرتی تھیں۔ لیکن پیشہ وارانہ علم کو ہمیشہ ہی قدرت کا ایک تحفہ اور خدا کی طرف سے سونپی گئی ذمہ داری سمجھا گیا ہے یعنی بندوں کی خدمت کے ذریعے خدا کی خدمت کی جائے۔ امیر کی طرح ان کی دنیا میں بھی دینی اور دنیاوی علوم کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں تھی۔ زیادہ تر انجمنوں میں ارکان کی تنظیم اور ان کے ہنر کا تحفظ کرنے کا حق کسی مخصوص علاقے تک محدود ہوتا تھا اور ٹیکس کی ادائیگی سے مشروط تھا۔ فری میسن کے ارکان اس طرح کی پابندیوں سے مستثنیٰ تھے۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان کی انجمن اپنی ہیئت میں مذہبی تھی۔ راہب اور پادری اکثر خود

بھی میسن ہوتے تھے۔ میسنوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ اصحاب ایمان ہوں، ایسے پادری جو اپنے ایمان کا اظہار پتھروں کی تعمیر کی صورت میں کرتے تھے۔ ان کی سب سے پہلی ذمہ داری خدا کا اور پھر چرچ کا فرمانبردار ہونا اور غلط کاریوں اور وسوسوں سے بچنا تھا۔ ان کا فرض تھا کہ وہ خیراتی کاموں میں حصہ لیں اور اپنے ارکان کی اچھی اخلاقی تعلیم کو یقینی بنائیں۔ ہنر سکھانے کی تعلیم محض پتھر اور لکڑی سے تعمیراتی کام سکھانے تک محدود نہیں تھی۔ میسن کی تعلیم اس طرح مرتب کی گئی تھی کہ اسے عالمگیر سچائیوں کا اظہار کرنے کے قابل بنائے۔ اسے ایک آرکیٹکٹ، معمار، بڑھئی اور سنگتراش بننے کی ضرورت تھی۔ اسے جیومیٹری، الٰہیات، آرٹ اور فلسفہ بھی سکھایا جاتا تھا۔

قرونِ وسطیٰ کی یہ میسنری تعلیم عبدالقادر کی تعلیم سے بس کسی حد تک مختلف تھی۔ خدا کے ہر جگہ موجود ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ چرچ کو خدا کے جاہ وجلال کا اظہار کرنے کے لیے معماروں کی ضرورت تھی جو اس کے چرچ، کیتھیڈرل اور خانقاہیں بنائیں۔ چرچ کے پاس اتنی اخلاقی اتھارٹی موجود تھی کہ وہ میسنز کو ان مقامی پابندیوں سے مستثنیٰ رکھے جو دیگر انجمنوں پر لاگو ہوتی تھیں۔ چرچ کی بالادستی کی وجہ سے میسن کوئی ٹیکس نہیں دیتے تھے اور بلا روک ٹوک سفر بھی کر سکتے تھے جس کی وجہ سے انہیں اپنے ضوابط کے تحت متعین کردہ دانشورانہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے جیسے دیگر لوگوں کے ساتھ ملنے اور راہ ورسم بڑھانے کا موقع ملتا تھا اور وہ ان کے ساتھ معلومات اور خیالات کا تبادلہ کر سکتے تھے۔

۱۸۱۵ء تک یہ فرقہ کٹر مسیحیت کی پابندی چھوڑ کر محض ایک توحید پرست گروہ بن گیا۔ اس کے ارکان کے لیے اب عیسائیت کے کٹر اصولوں کی پیروی ضروری نہیں تھی، بلکہ بس ایک خالق اور اخلاقی قانون کو ماننا کافی تھا۔ ''میسن انسانوں کے درمیان اخلاقی قانون کی پاسداری کرنے کا پابند ہے۔..... اسے یہ سمجھنا چاہیے کہ خدا کا دیکھنا انسان کے دیکھنے سے مختلف ہے۔ انسان چیزوں کا ظاہر دیکھتا ہے، لیکن خدا دل میں جھانکتا ہے۔ کسی انسان کا مذہب یا خدا کی پرستش کرنے کا انداز چاہے کوئی بھی ہو، جب تک وہ آسمان اور زمین کے بزرگ وبرتر خالق پر ایمان رکھتا ہے اور ساتھی انسانوں سے متعلق اپنی اخلاقی ذمہ داریاں پوری کرتا ہے، اس سے ناتا توڑا نہیں جا

سکتا۔"

۱۸۶۴ء میں امیر کو دمشق میں شام کے میسونی لاج کا اعزازی گرینڈ ماسٹر نامزد کیا گیا۔ اس کے ایک برس بعد جب عبدالقادر فرانس گیا تو اسے فرانسیسی لاج "ہنری چہارم" میں شامل کرلیا گیا جس میں بنجمن فرینکلن، لاپلاس، لافاییٹ، وولٹیئر، سوٹ، مونجے، تالے راں، پرودوں اور دیگر ایسی ممتاز ہستیاں موجود تھیں جن کے لیے مظاہر فطرت، عقل اور اخلاقی قانون سب ایک الوہی تخلیق کار کے باہم موافقت رکھنے والے مظاہر تھے۔

میسونی تنظیم میں امیر کی رکنیت ۱۸۷۷ء تک برقرار رہی۔ جب اس سوسائٹی میں الحاد پرستوں کو بھی شامل کرلیا گیا تو عبدالقادر کے نزدیک یہ اس تنظیم کا ناقابل قبول اقدام تھا جس کے ارکان نے عیسائیت سے الگ ہوکر محض توحید پرستی کی راہ اپنائی تھی اور اب سوسائٹی بے خدا انسان پرستی کو قبول کرنے کے راستے پر چل نکلی تھی، چنانچہ عبدالقادر نے اس سے علیحدگی اختیار کرلی۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ اس تنظیم میں داخلے کے بعد کوئی نام نکل نہیں سکتا۔ امیر صاحب تو تیرہ سال تک گرینڈ ماسٹر رہے تھے۔ یہ کیسے علیحدگی اختیار کرسکتے تھے۔

ـــ ۲۴ ـــ

ماحول کے اجنبی

ایک عظیم انسان دوست شخصیت اور عیسائیوں کے محافظ کے طور پر عبدالقادر کو ملنے والی نئی شہرت نے اس کی رہائش گاہ کو دمشق میں یورپ سے آنے والے ہر شخص کے لیے قابل دید مقام بنا دیا تھا۔ فرانسیسی حکومت نے امیر کے کارناموں پر اس کی سالانہ پنشن ایک لاکھ سے بڑھا کر ڈیڑھ لاکھ فرانک کر دی تھی۔ ۱۸۶۵ء میں سینٹ نے عبدالقادر کو اس کے الجزائری ساتھیوں سمیت فرانس کی شہریت دے دی۔* اسی سال پیرس اور لندن کے دورے کرتے ہوئے عبدالقادر نے اپنی ذات کے گرد قائم ہونے والے تقدس اور پرہیزگاری کے اس نئے ہالے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے استنبول کی حکومت سے ان اکابرین کی جلد رہائی کی درخواست کی جنھیں ۱۸۶۰ء کے قتل عام کی تحقیقات کرنے والے غیر معمولی ٹربیونل نے دیس نکالا دے دیا تھا۔ امیر نے لوئی نپولین سے بھی درخواست کی کہ وہ زار الیگزینڈر سے امیر شامل کے بارے میں بات کرے۔ یہی درخواست عبدالقادر نے لندن میں ملکہ وکٹوریہ کے ساتھ ایک نشست میں بھی کی۔ مناسب وقت گزرنے پر شامل کو کوہ قاف واپس جانے کی اجازت مل گئی۔

سترہ نومبر ۱۸۶۹ء کو جب نہر سویز کھولنے کی افتتاحی تقریب منعقد ہوئی تو امیر کو بھی گرینڈ پویلین میں نپولین کی بیوی، ملکہ یوجین، آرچ ڈیوک وکٹر آف آسٹریا، شاہ ہنگری اور ساری دنیا

* فرانسیسی شہریت میں انھیں فرانس کے شہریوں کو حاصل تمام حقوق نہیں دیے گئے تھے اور سیاہ فام امریکیوں کی طرح الجزائری نژاد فرانسیسی بھی دوسرے درجے کے شہری تھے۔

اس وقت رہا تھا جب اس کے والد کی مجلس میں بے حسین کی طرف سے تحفظ فراہم کرنے کی درخواست پر بحث ہو رہی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ زیرِ عتاب شاذلیوں کی جان بخشی کر کے انھیں ملک بدر کر دیا گیا۔

آئزابیل جب اپنا سامان باندھ کر روانگی کی تیاری کر رہی تھی تو ہر طرف سے اس کے شوہر کی اخلاقی حمایت میں موصول ہونے والے خطوط کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ عبدالقادر نے اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں برٹن کی رخصتی پر اداسی کا اظہار کیا تھا۔ جب آئزابیل اپنے شوہر کے پاس بیروت جانے کے لیے ریل گاڑی پر رخصت ہوئی تو اسے الوداع کہنے کے لیے صرف دو افراد سٹیشن پر موجود تھے، عبدالقادر اور جین ڈگبی۔ ان دونوں کے بارے میں آئزابیل کا کہنا تھا کہ وہ دمشق کے دلچسپ ترین لوگ ہیں جو خوف نام کی کسی چیز سے واقف نہیں ہیں۔

جین ڈگبی کا شمار بھی ایسی ہی شخصیات میں تھا جن سے ملنے کی باہر سے آنے والوں کو آرزو ہوتی تھی۔ عبدالقادر کی جین سے ملاقات ۱۸۵۵ء میں دمشق آنے کے کچھ عرصہ بعد ہی ہو گئی تھی جب جین نے برطانوی قونصل اور دیگر یورپی باشندوں کی طرف سے سنگین نتائج سے خبردار کیے جانے کے باوجود ایک بدو سردار سے بیاہ رچا لیا تھا۔ ان سب کو پورا یقین تھا کہ یہ شادی جلد ہی برے انجام سے دوچار ہو گی، لیکن ان سب کے لیے حیرت کی بات تھی کہ عاشقوں کی ایک طویل فہرست اور لندن سے براستہ پیرس، میونخ اور ایتھنز شام پہنچنے تک چھ شادیاں بھگتانے کے بعد جین کو حقیقی معنوں میں خوشی مل گئی تھی۔

جین ڈھلتی ہوئی عمر کے عبدالقادر کی بھی منظورِ نظر بن گئی تھی جس نے احتیاط سے خضاب لگی ہوئی سیاہ داڑھی کے ساتھ اپنی جوانی کا تاثر قائم رکھا ہوا تھا۔ جین باقاعدگی سے نقیب ایلی آنے والے مہمانوں میں شامل تھی اور گرمیوں میں اکثر ان مہمانوں میں شامل ہوتی تھی جو امیر کی رہائش گاہ پر دریائے برادا کا نظارہ کرتے ہوئے پودینے کی چائے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ جین نے اپنے شوہر مید جوئیل المرزگ کے ساتھ یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ سال میں چھ ماہ یورپی طرز کے مطابق زندگی بسر کرے گی۔ باقی چھ ماہ وہ بدو عورتوں کی طرح صحرا میں بکری کی کھال سے بنے خیمے میں گزارتی تھی۔ وہ انہی کی طرح ننگے پاؤں پھرتی، روایتی نیلا چغہ پہنتی، سر پر رومال باندھتی، دیگر

عورتوں کے ساتھ الگ خیمے میں رہتی اور پوری تندہی کے ساتھ اپنے خاوند کی خدمت کرتی تھی۔

برطانوی امرا کی بہترین روایت کے مطابق اس نے یونانی، لاطینی اور فرانسیسی زبانوں کی تعلیم حاصل کی تھی جن میں بعد ازاں اس نے اطالوی، جرمن، روسی اور عربی زبانیں خود شامل کر لیں۔ وہ ایک بہترین شہسوار، باصلاحیت مصورہ اور خاکہ سازی کی ماہر فنکار تھی۔ وہ بہت اچھی نشانہ باز بھی تھی۔ برٹن کی طرح اسے بھی اپنے ملک میں مردود قرار دے دیا گیا تھا اور لوگ سرگوشیوں میں کہتے تھے ''وہ دیکھو، اس نے ایک کالے سے شادی کی ہے۔''

میدجوئل المرزگ کے ساتھ شادی نے ڈگبی جین کی اس دھماکہ خیز رومانی زندگی کا خاتمہ کر دیا جس نے اسے سارے انگلینڈ میں بدنام کر رکھا تھا۔ لیکن جین کی خوشی اور اپنے شوہر کی ثقافت کو خلوص سے اپنانے کا ثبوت ہر صاحب بصیرت کو نظر آتا تھا۔ وہ عمر میں اپنے شوہر سے بڑی تھی اور زیادہ باعمل نہ سہی، لیکن عیسائی تو تھی۔ دوسری طرف اس کا شوہر ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا، لیکن اس کے باوجود دونوں کو ایک دوسرے کے عقیدے کا احترام کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔

ڈگبی جین اور برٹن دونوں کے لیے برطانیہ کی زندگی لگے بندھے رسوم و رواج اور وکٹورین طرز کے تکلفات سے عبارت تھی۔ اس کی دلچسپی کا مرکز بھی وہی چیزیں تھیں جن میں برٹن کو دلچسپی تھی۔ کھلی فضا، جنگل کا ویرانہ، آزادی اور مشرق کی مہم جوئی۔ جین کا مطالعہ بھی بہت وسیع تھا اور وہ ہر موضوع پر بے تکان گفتگو کر سکتی تھی۔ دلآویز شخصیت کی مالک لیڈی جین گھڑ سواری میں کسی بھی مرد سے کم نہیں تھی اور رزمیہ میں بھی حصہ لے سکتی تھی۔ وہ وفادار اور باہمت عورت تھی۔

عبدالقادر کو ان تمام صلاحیتوں کا علم تھا۔ جب ۱۸۶۰ء میں خونریزی کا آغاز ہوا تو عبدالقادر نے اپنے بیٹے کو پرانے شہر کی فصیل سے باہر میدان کے محلے میں واقع جین کے گھر بھیجا اور ان سب کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی، لیکن اس نے اصرار کیا کہ وہ اپنے شوہر کے گھر پر محفوظ ہے اور چونکہ اس کے سارے ملازم عیسائی ہیں، اس لیے وہ انہیں بھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ جب خوف سے سہمے ہوئے عیسائیوں نے اس کا دروازہ دھڑ دھڑایا تو جین نے انہیں اندر بلا لیا حالانکہ اس کے شوہر میدجوئل نے خبردار بھی کیا کہ مشتعل ہجوم رات کو ان گھروں پر دوبارہ حملہ کر سکتا ہے جہاں

عیسائیوں کو پناہ دی گئی ہے۔ جب قتل و غارت گری کا زور ٹوٹا تو اس نے بدو والا چغہ پہنا اور عیسائی محلے میں چلی گئی تاکہ دیکھے کہ متاثرین کی کس طرح مدد کی جا سکتی ہے۔ وہ کئی روز تک لوگوں میں روٹیاں اور ادویات تقسیم کرتی رہی اور اس دوران اسے مسخ شدہ نعشوں اور کتوں کے بھنبھوڑے ہوئے، ادھ کھائے گلتے سڑتے تعفن زدہ انسانی جسموں کے درمیان سے بھی گزرنا پڑتا تھا جنھوں نے فضا کو طاعون اور ہیضے سے آلودہ کر دیا تھا۔ اس کی ثابت قدمی، خدا ترسی اور جذبہ ایثار جولائی کے ان اندوہناک دنوں میں سب پر عیاں ہو گئے تھے۔ یہی وہ صفات تھیں جنھیں عبدالقادر اپنے ''حوصلے کے ساتھی'' کہتا تھا۔ جین ڈگبی المزرگ امیر کو اب اس سے کہیں زیادہ پیاری ہو گئی تھی جتنا وہ اپنے حسن اور ذہانت کی وجہ سے پہلے تھی۔

اسے ایک بار امیر کے حرم کا جائزہ لینے کا بھی موقع ملا۔ یہ افواہ گرم تھی کہ امیر ہر سال نئی شادی کرتا ہے جو عموماً سرکیشائی لڑکیاں ہوتی ہیں جن کی عمر پندرہ سال سے زیادہ نہیں ہوتی، لیکن جین کی رپورٹ یہ تھی کہ اگر اس نے ان میں سے بیشتر کو طلاق دے کر رخصت نہیں کر دیا تو پھر یہ افواہ غلط ہے۔ اسے وہاں صرف پانچ بیویاں نظر آئی تھیں*، لیکن یہ تعداد بھی اسلامی شریعت میں دی گئی اجازت کی حد سے ایک زیادہ بنتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی بیوی خیرا کے بارے میں، جس کی امیر سب سے زیادہ قدر کرتا تھا، جین کا کہنا تھا کہ ''انتہائی موٹی اور جسمانی طور پر بدصورت تھی، لیکن وہ پورے وقار اور پرسکون تحکم کے ساتھ حرم کی سربراہی کرتی تھی۔''

اپنی زندگی کے آخری بیس سال جین نے ایک عرب سردار کی وفا شعار اور محبت کرنے والی بیوی بن کر گزارے۔ جین ڈگبی (Jane Digby) جس طرح مغرب میں منفرد تھی، ویسے ہی مشرق میں بھی منفرد ہی رہی۔ برٹن کی طرح وہ اپنا قانون خود تھی۔ اس نے اپنے بارے میں پہلے سے قائم کیے گئے تمام تصورات کو غلط ثابت کر دیا تھا۔

---

* جین کی اطلاع کی تصدیق کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ دمشق میں امیر کے بعض جانشینوں میں یہ گفتگو سننے میں آتی ہے کہ امیر نے ایک سرکیشائی لڑکی کو بھی بیوی بنایا تھا۔ ان میں سے ایک کا یہ بھی کہنا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب امیر کی پانچ بیویاں تھیں۔ ہوسکتا ہے امیر کی کسی لونڈی کو بھی بیوی سمجھ لیا گیا ہو۔

ملا تبصرہ

عبدالقادر برطانیہ کی دو ایسی شخصیات کا دوست اور معترف تھا جو اپنی ثقافت سے باغی تھیں۔ ایک وہ آزاد خیال روایت شکن جس نے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوششوں میں تعاون کیا اور جس کے پسندیدہ موضوعات میں پرشہوت عورتیں، جسم فروشی اور زنخا بنانے کے طریقے شامل تھے، جب کہ دوسری شخصیت اخلاق باختہ سمجھی جانے والی ایک خود پسند اور بدنام عورت تھی جس نے اپنی جنسی مہم جوئی کے لیے اپنا بچہ تک چھوڑ دیا۔

لیکن کیا عبدالقادر ایک پکا مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ جو بے حد سادگی پر عمل پیرا اور دنیاوی آسائشوں سے دور رہنے والا ہو، ایک ایسا باغی بھی نہیں تھا جس نے پرانے طور طریقوں کو بدل کر رکھ دیا؟ کیا اس نے ان عام رائج رسومات کی مذمت نہیں کی جو قرآن کی صحیح تعلیمات کے خلاف تھیں یا انھیں قرآنی تعلیمات سمجھا جاتا تھا؟ اور ایسا اس نے قانون یا روایت کے لیے اپنی ذاتی پسند ناپسند یا عدم احترام کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے گہرے علم اور قانون کے سخت اور بے لاگ اطلاق کی وجہ سے کیا۔ اس نے قبائل کو زمانہ امن میں بھی جنگی ٹیکس دینے پر مجبور کیا۔ ایسا کبھی سننے میں نہیں آیا۔ اس نے میدان جنگ میں قیدیوں کے سر کاٹنے کی صدیوں پرانی رسم کا خاتمہ کیا۔ اس نے قیدی بنائے گئے فرانسیسی فوجیوں کے ساتھ انسانی بنیادوں پر سلوک کرنے پر اصرار کیا۔* امیر نے بے گناہ عیسائیوں کو خون کے پیاسے مسلمانوں کی دست برد سے بچایا اور اس حرکت نے بہت سے کم روشن خیال مسلمانوں کی نظر میں امیر کو فرانس کا پٹھو اور کافر بھی بنا دیا۔

عبدالقادر نے ہتھیار اس لیے پھینکے تھے کہ خدا بے کار تکلیف برداشت کرنے کو پسند نہیں کرتا۔ اس نے مراکش کے کمزور اور دغاباز سلطان کی بجائے فرانسیسی جرنیلوں کی زبان پر اعتبار کرنے کو ترجیح دی۔ کسی مسلمان جنگجو کے لیے اس سے بڑی بدنامی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ ۱۸۴۷ء میں

---

* عبدالقادر کی انسان دوستی اور خاص طور پر قیدیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کے اصول انسانی حقوق اور قیدیوں کے حقوق کو منضبط کرنے کے سلسلے میں ۱۹۴۹ء کے جنیوا کونشنز کا پیش خیمہ تھے۔ اپریل ۲۰۰۶ء میں اقوام متحدہ کے زیر اہتمام جنیوا میں ''جائے اقوام'' پر ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس ''عبدالقادر: انسانی حقوق کا سرخیل اور بین المذاہب مکالمے کا علمبردار'' بھی انسان دوستی کے میدان میں عبدالقادر کے کارہائے نمایاں کے بارے میں تھی۔

گرج چمک کے ساتھ بارش والی دسمبر کی اس رات کو امیر کا فیصلہ اسی احترام کے ساتھ قبول کیا گیا تھا جس کے ساتھ وہ فیصلہ وجود میں آیا تھا اور اسے قبول کرنے والوں میں امیر کے وہ سرفروش ساتھی بھی تھے جو صحرا میں مرتے دم تک جنگ جاری رکھنے کو تیار تھے۔ لیکن اس جنگجو ولی کے دامن پر سب سے بدنما داغ قبائلی روایات اور نظام سے بغاوت کا تھا۔ پرانی جنگجو اشرافیہ جس کی نمائندگی اس کا ناقابل شکست حریف بن اسماعیل کرتا ہے، اس نوجوان مرابط کو اپنا تابع نہ کرسکی جو مذہبی علم اور اخلاقی کردار کو اکثر خون کے رشتوں اور بزرگی پر فوقیت دیتا تھا۔

برٹن اور ڈگبی اپنے انگریزی تشخص میں بے سکون تھے اور نیا تشخص چاہتے تھے۔ عبدالقادر کو پورا اعتماد تھا کہ اسلام ہی وہ تشخص ہے، لیکن کیا پھر بھی وہ ایک بلند تر شناخت کی تلاش میں نہیں تھا جو دوسروں کو محض اس لیے الگ نہ کر دے کہ وہ غیر مسلم ہیں؟ اس سوچ نے بعض مسلمانوں کی نظر میں اسے ناپسندیدہ بنا دیا تھا۔ اپنے دوست سوئس بنکار اور مقدس سائمن کے پیروکار شارل اینار (Charles Eynard) کے نام ایک خط کی عبارت سے ایسا لگتا ہے جیسے اس نے اپنی ذات کو پہچان لیا تھا: ''میں اتنا زیادہ متحمل مزاج ہو گیا ہوں کہ تمام انسانوں کا احترام کرنے لگا ہوں، چاہے ان کا مذہب کوئی بھی ہو...... میں کوشش کرتا ہوں کہ کسی کو نقصان نہ پہنچاؤں بلکہ اس کے ساتھ بھلا کروں۔ خدا نے انسانوں کو اپنی اطاعت کے لیے تخلیق کیا ہے، دوسرے انسانوں کی اطاعت کے لیے نہیں۔''

سائمن پیٹر کے الفاظ، جو فرانس میں بائبل کا مطالعہ کرنے کے دوران میں امیر کی نظر سے بھی ضرور گزرے ہوں گے، امیر کے ہاتھ کے لکھے ہوئے بھی ہو سکتے تھے: ''عقیدے میں ظرف شامل کرو، ظرف میں علم، علم میں ضبط نفس، ضبط نفس میں ثابت قدمی، ثابت قدمی میں تقویٰ اور تقوے میں برادرانہ رحم دلی اور محبت۔'' عبدالقادر کا اسلام کوئی سیفٹی بیلٹ نہیں تھی جس سے وہ اپنی حفاظت کے لیے بندھا رہتا بلکہ یہ ایک پلیٹ فارم تھا جس پر کھڑا ہو کر وہ خدا کی متنوع تخلیق کی گہرائی اور معنویت میں جھانک سکتا تھا۔ وہ لوگوں کو متحد کرنے والا تھا، الگ الگ کرنے والا نہیں۔ علم اور اعلیٰ ظرفی اس کے سب سے بڑے ہتھیار تھے۔

عبدالقادر کی روح بھی اب اس سائنسدان کی مانند ہوگئی تھی جو یونیفائیڈ فیلڈ تھیوری کو ثابت کرنے کی دھن میں تھا۔ عبدالقادر کا رہنما ابن عربی تھا۔ ۲۵ رمئی ۱۸۸۳ء کو گردے فیل ہو جانے سے عبدالقادر کا انتقال ہوگیا۔ اس کی روح اپنی اصل سے جاملی۔ وصیت کے مطابق امیر کو صالحیہ کی پہاڑیوں پر ابن عربی کی مسجد میں اس کے رہنما کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ یہ جگہ سر رچرڈ برٹن کے ولا سے محض تھوڑی دیر کی غبار آلود چہل قدمی کے فاصلے پر ہے۔

امیر کی وفات کی پیشین گوئی تین ماہ پہلے ہی نیویارک ٹائمز میں شائع ہونے والی ایک تحریر میں کر دی گئی تھی۔ آٹھ سو الفاظ پر مشتمل امیر کی اس مختصر سی سوانح عمری میں فیصلہ دے دیا گیا تھا:

''اگر امیر کے بارے میں اس کے دشمنوں کا اندازہ درست ہے تو اس صدی کے سب سے باصلاحیت حکمرانوں اور سب سے ذہین و فطین کپتانوں میں سے ایک، تمام تر ممکنہ اندازوں کے مطابق اب اپنے طوفانی 'کیریئر' کے اختتام تک پہنچنے کو ہے۔ عبدالقادر خطرناک حد تک بیمار ہے۔ اس کی زیادہ عمر اور کم و بیش دو عشروں پر محیط جنگجو زندگی نے یہ یقین کرنے کا امکان بہت کم چھوڑا ہے کہ اب وہ زیادہ تر تک زندہ رہے گا۔ ..... اس کے کردار کی نجابت نے، جو کسی بھی طرح میدان جنگ میں اس کی کامیابیوں سے کم تر نہیں ہے، بہت عرصہ پہلے ہی اسے ساری دنیا کی ستائش کا حق دار بنا دیا تھا۔ ..... عظیم آدمی اتنی فراوانی سے نہیں ملتے کہ ہم ان کے لیے دو بول کہے بغیر انہیں گنوا دیں۔ ..... ایک پکا محبِّ وطن، ایک ایسا سپاہی جس کی فطانت اور حاضر دماغی شک و شبہے سے بالاتر ہو، جس کا وقار بے داغ ہو، ایک ایسا ریاست کار جو افریقہ کے جنگلی قبائل کو متحد کر کے بے مثال مد مقابل بنا سکے، ایک ایسا ہیرو جو حرف شکایت زبان پر لائے بغیر شکست اور تباہی کو تسلیم کر لے، اگر یہی وہ خوبیاں ہیں جو ایک آدمی کو عظیم بناتی ہیں تو پھر عبدالقادر اس صدی کے چند گنے چنے عظیم آدمیوں کی سب سے اگلی صف میں کھڑا ہونے کا حق دار ہے۔''

مغرب کی نظر میں ہیرو بننے کی اصل وجہ:

ہتھیار ڈال کر شکست تسلیم کرلیا۔

"ایک پکا محب وطن، ایک ایسا سپاہی جس کی فطانت اور حاضر دماغی شک وشبے سے بالاتر ہو، جس کا وقار بے داغ ہو، ایک ایسا ریاست کار جو افریقہ کے جنگلی قبائل کو متحد کر کے بے مثال مد مقابل بنا سکے، ایک ایسا ہیرو جو حرف شکایت زبان پر لائے بغیر شکست اور تباہی کو تسلیم کر لے، اگر یہی وہ خوبیاں ہیں جو ایک آدمی کو عظیم بناتی ہیں تو پھر عبدالقادر اس صدی کے چند گنے چنے عظیم آدمیوں کی سب سے اگلی صف میں کھڑا ہونے کا حق دار ہے۔" (نیو یارک ٹائمز، فروری ۱۸۸۳ء)



"امیر عبدالقادر الجزائریؒ کے سوانح وافکار اور عملی جدوجہد کے بارے میں جان کائزر کی یہ تصنیف نئی پود کو ان کی شخصیت اور جدوجہد سے واقف کرانے میں یقیناً مفید ثابت ہوگی ایسی شخصیات کے ساتھ نئی نسل کا تعارف اور ان کے کردار اور افکار و تعلیمات سے آگاہی استعماری تسلط اور یلغار کے آج کے تازہ عالمی منظر میں مسلم امہ کے لیے راہ نمائی کا ذریعہ ہے اور اس سمت میں کوئی بھی مثبت پیش رفت ہمارے لیے ملی ضرورت کی حیثیت رکھتی ہے" (ابوعمار زاہد الراشدی)

جان کائزر کے قلم سے درج ذیل تصانیف مقبولیت حاصل کر چکی ہیں:

- Communist Entrepreneurs, Unknown Innovators in the Global Economy,
- Stefan Zweig: Death of a Modern Man,
- Monks of Tibhirine: Faith, Love and Terror in Algeria (ایوارڈ یافتہ)

جان کائزر نے کولمبیا یونیورسٹی سے یورپی تاریخ میں ایم اے اور یونیورسٹی آف شکاگو سے ایم بی اے کیا ہے اور اپنے اہل خانہ کے ساتھ ورجینیا (امریکہ) میں مقیم ہیں۔